ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

AUGUST 1985

MONTHLY HAYAT - E - NAU AUGUST 1985
BILARIA GANJ AZAMGARH (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ حیاتِ نو

اگست ۱۹۸۵ء

مدیر

طارق فارقلیط فلاحی

قیمت فی شمارہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے ★

★ سالانہ زر تعاون ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ: جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ یو۔پی 276121

(مطبوعہ شاداب پرنٹنگ پریس فیض آباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوش حیات نو

اداریہ

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب ــــــ ایڈیٹر ۳

انٹرویو

جناب ڈاکٹر اسرار صاحب سے ایک انٹرویو ــــــ ابو سفیان اصلاحی ۷

مقالات

ڈاکٹر بنت الشاطی کی تفسیر بیانی کا مطالعہ ــــــ قسط ۲۔ جمیل اللہ فہد فلاحی ۱۷

حضرت عمیر بن سعدؓ ــــــ ابو جاوید ۳۰

ترقی ــــــ عبدالغفار سوز ۴۱

حیات نو تنقید و تحلیل ــــــ محمد بن رحیم ۴۷

جبرلی امین صدیقی۔ جمیل اللہ فہد توقیر احمد خان ۵۵

حلقہ یاراں

جامعہ کے لیل و نہار ــــــ ٹی ایف فلاحی ۵۶

شعر و نغمہ

غزل ــــــ ڈاکٹر شرفی سہاقی ۲۹

غزل ــــــ شفق طاہری ۴۰

غزل ــــــ اختر اعظمی جلالپوری ۴۰

قطعات ــــــ عطا عابدی ۴۲

اداریہ

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے اپنی بغض و عداوت کی بنیاد پر مقدمہ سے متعلق مقدمہ کا جو فیصلہ سنایا اس سے تمام مسلمان تڑپ اٹھے لیکن جب ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء کا سورج طلوع ہوا تو ان کی بے چینی اپنی انتہا کو پہنچ گئی انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں انکی عزت انکی جان، انکا مال، انکا عقیدہ، انکا مذہب ان کا قرآن کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ انھیں یہاں کی حکومت اسکی یقین دہانیاں، سیکولرزم شوارزم، اور جمہوریت ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اپنے ہی ملک میں، اپنی ہی حکومت میں، اپنے ہی کورٹ کے سامنے اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں انکی بے بسی قابل دید تھی۔ آج سے ۴۰ سال پہلے آزادی کے حصول کے لئے کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے والا جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے والا اور اپنا سب کچھ قربان کرنے والا یہاں تک کہ پھانسی پر لٹکنے والا گولیوں کو سینے پہ روکنے والا مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صرف چند ہی دہائیوں میں اس مقام پر پہنچ جائے گا۔ آج اگر مولانا ابوالکلام آزاد ہوتے، مولانا شوکت علیؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ ہوتے تو اسکو کس طرح برداشت کرتے کیا انکی روح تڑپ تڑپ نہیں گئی ہوگی۔

۱۳ مئی ۱۹۸۵ء کی صبح مسلمانوں کے لئے کچھ مبارک صبح نہ تھی، اسکے اندر ایک عجیب طرح کی بے چینی اور کشمکش تھی اسکے قدم دھیرے دھیرے کلکتہ ہائی کورٹ کی طرف بڑھ رہے تھے آج وہ صوبہ بنگال کی سب سے بڑی عدالت میں اپنی عظیم ترین اور مقدس ترین کتاب پر فیصلہ سننے گئے تھے، فیصلہ وہ لوگ کرنے والے تھے جن کا علم جن کا مطالعہ جنکی عقل و فکر کسی وقت بھی نا اہلی اور توتلی جا سکتی ہے اور اس ذات مقدس کے کلام کے متعلق سننے والے تھے جس کی

پر عطر کی بارش کرنا، لڑائی جھگڑے کے وقت ہاتھوں میں اٹھانا، شادی بیاہ میں جہیز میں دینا اور مرنے والے انسانوں کے پاس تلاوت کرنا تاکہ انکی روح آسانی سے نکل جائے اس سے زیادہ قرآن کا کوئی اور مصرف ہمارے پاس نہیں تھا لیکن اب ہمیں خواب غفلت سے بیدار ہونا چاہیے اور آگے بڑھ کر زندگی کا ثبوت دینا چاہیے۔

قرآن اللہ تعالی کا کلام ہے جو ۲۳ سال کی طویل مدت تک رسول اکرم کے قلب مبارک پر ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تحریک اسلامی کے قافلے کی رہنمائی کرتے۔ یہ طور تحریک اسلامی کا یہ قافلہ قرآن کی صاف و شفاف تیز و روشن روشنی میں برابر آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ عرب کے ریگزار و بیابان اسکے نور سے منور اور اسکی روشنی سے جگمگا اٹھے۔

قرآن خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ یہ انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے۔ یہ زندگی کا دستور، روشنی کا مرکز اور منبع ہے۔ انسان کی زندگی اسکے ضابطوں اور اسکے قوانین پر چل کر ہی کامیاب ہو سکتی ہے اور انسان اسکو چھوڑ کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا میں خدا کی آخری کتاب اور اللہ کی کا آخری منشور ہے۔ آج ۱۵ سو سال گذر جانے پر بھی اسکے الفاظ اپنے معنوں، اس کی آیتوں تک زیر و زبر تک میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان الفاظ میں قرآن کو خراج عقیدت پیش کیا۔

"آپ نے فرمایا۔ قرآن اللہ کا بچھایا ہوا دسترخوان ہے تو جہاں تک تمہارے اندر طاقت ہے خدا کے اس بچھائے ہوئے دسترخوان پر آؤ۔ بلاشبہ یہ قرآن اللہ کی رسی ہے تاریکیوں کو چھانٹنے والی روشنی ہے۔ فائدہ دینے والی اور شفا بخشنے والی دوا ہے۔ جو لوگ اسکو مضبوطی سے تھامے رہیں گے انکے لئے یہ محافظ ہے اور پیروی کرنے والوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ کتاب بے رخی نہیں کرتی کہ اسکو منانے کی ضرورت پڑے۔ اس کتاب میں کوئی ٹیڑھ نہیں پایا جاتا ہے جسکو سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اسکے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے اور کثرت پڑھنے سے پرانی نہیں ہوتی۔"

اس کا عربی ادب بہت ہی بلیغ ہے۔

قدرت جس کی طاقت، جس کی معلومات لامحدود ہیں۔ مسلمانوں کا ایک جم غفیر فیصلہ سننے کے لئے جمع ہو گیا تھا اور وقت کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا ...... پریشانی کی لکیریں انکی پیشانیوں پر صاف طور سے دیکھی جا سکتی تھیں اور پریشانیاں کیوں نہ ہوتے ہائی کورٹ کے فیصلہ کے ساتھ انکو خود بھی ایک فیصلہ کرنا تھا ...... زندگی کا فیصلہ، موت کا فیصلہ ...... ایمان کا فیصلہ، ایقان کا فیصلہ، شجاعت کا فیصلہ شہادت کا فیصلہ ...... اور یہ فیصلہ ہائی کورٹ کے فیصلہ سے زیادہ اہم تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسکی نوبت نہیں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اب مسلمانان ہند کی تاریخ ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ ابتک مسلمانوں اور اسلام سے متعلق تمام الزامات، اعتراضات اور پروپیگنڈے اخبارات، رسائل اور کتابوں تک محدود تھے لیکن اب اسلام دشمن اور اسلام مخالف طاقتیں سول کورٹ میں لڑنے کا منصوبہ بنا رہی ہیں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا حالیہ مقدمہ اسکی ابتدا ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ یہ باطل قوتیں اور اسلام دشمن طاقتیں خواہ یہ چاند مل چوپڑہ اور شیتل سنگھ کی شکل میں ہوں، یا نتھن زیشج اور مجمہ بانگی، ہنس بیگ اور کریم چھاگلہ کی شکل میں دلائل صحافت اور پروپیگنڈے کی فیلڈ میں شکست کھا چکے ہیں اور اب عدالت اور کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں جہاں انھیں امید ہے کہ حکومت اور عدلیہ دونوں انکی پشت پناہی کریں گے اور انکا تعاون کریں گے۔ مسلمانان ہند کے لئے وقت کا یہ اہم چیلنج ہے جسکا انھیں سامنا کرنا ہے۔ ہم مسلم عوام، تعلیم یافتہ طبقہ، خصوصاً وکیلوں اور قانون دانوں نیز مسلم مفکرین، زعماء اور لیڈروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آگے بڑھیں اور مسلم ملت کی صحیح رہنمائی کریں نیز حکومت ہند سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہم کو زیادہ آزمائش میں نہ ڈالے گی صبر کا پیمانہ کسی وقت بھی چھلک سکتا ہے۔

ایسے نازک وقت میں مسلم عوام اور مسلم ملت کی ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں ابتک وہ سوتے ہوئے تھے، غافل تھے، بے خبر تھے، قرآن کو ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر خوبصورت الماریوں میں سجا دیا تھا ان

اسکے الفاظ اور جملے نہایت شیریں، سیدھے اور دل میں گھر کرنے والے ہیں۔ اسکو آپ جتنی بار پڑھیں گے قربت، حلاوت، اشغال اور لذت بڑھتی جائے گی یہاں تک کہ آپ اس میں غرق ہو جائیں گے کفار مکہ دن کی روشنی میں اس کی مخالفت کرتے تھے لیکن رات کو خانہ کعبہ کی دیواروں سے چپٹ چپٹ کر قرآن سنتے تھے۔ اور جن کے کانوں میں قرآن کی آواز پہنچ جاتی تھی وہ اسقدر دل ہار جاتا تھا۔ حضورؐ نے اپنے آخری ایام میں فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم اس وقت تک گمراہ نہیں ہوگے جب تک ان دونوں چیزوں کو پکڑے رہو گے اور وہ اللہ کا کلام قرآن ہے اور میری سنت۔ اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ جب تک ہم قرآن کو پکڑے رہے سے عزت اور سربلندی ہمارے پیچھے پیچھے دوڑتی رہی اور جب ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے قرآن ہمارے لئے عروج و زوال کا ضامن اور عزت و دولت کا معیار ہے۔ آج پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم قرآن کی طرف رجوع کریں۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل اسی میں تلاش کریں۔ اسکو پڑھیں بار بار پڑھیں، اس شعور کے ساتھ پڑھیں کہ وہ ہمارے ہی دور اور ہمارے ہی مسائل کے لئے نازل ہوا ہے۔ جب تک یہ احساس ہمارے دلوں میں گھر نہیں کرے گا ہمارے قدم منزل کی طرف نہیں اٹھیں گے۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

طارق [illegible]

۱۱-۷-۱۹۹۵

فرمان نبوت

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ثواب بازار اور گھر میں ادا کرنے کے ثواب سے ۲۵ درجہ زیادہ ہے اسلئے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح سے وضو کرتا ہے پھر نماز کی غرض سے مسجد میں آتا ہے کوئی دوسرا مقصد اسکے پیش نظر نہیں تو ہر قدم کے بدلے میں ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ دور ہوتا ہے، مسجد میں رہنے تک نماز کی انتظار میں بیٹھا رہتا ہے نماز کے ثواب کا مستحق رہتا ہے اور جو شخص نماز ادا کرنے کے بعد بے وضو ہوئے کسی کو تکلیف دیئے بغیر مسجد میں بیٹھا رہتا ہے فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں یا اللہ اس پر رحم فرما، اے اللہ اسکو معاف فرما، اے اللہ اس پر توجہ فرما۔

(بخاری مسلم)

ابو سفیان اصلاحی شعبۂ عربی
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔

جناب ڈاکٹر اسرار صاحب سے ایک انٹرویو

بہت دنوں سے پاکستان جانے کا خیال تھا خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ خواہش بر آئی اکتوبر میں وہاں پہنچا وہاں پہنچ کر بہت سی ادبی و دینی شخصیات سے نہ صرف ملنے کا بلکہ انکا انٹرویو ریکارڈ کرنے کا شرف نصیب ہوا کراچی میں جسٹس شریعت کورٹ و ایڈیٹر البلاغ جناب مولانا تقی عثمانی صاحب عظیم شاعر صہبا اختر ایڈیٹر حریت جناب رسا چغتائی اور وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب سے رہی۔ اسلام آباد میں ڈاکٹر شرف الدین صاحب اصلاحی اور ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی ڈاکٹر ایس ایم زمانی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ راولپنڈی میں معروف ناول نگار جناب نسیم حجازی سے ملنے کا موقع رہا اور لاہور میں محترم المقام جناب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور ڈاکٹر اسرار احمد جو انجمن خدام القرآن کے موسس و ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن کے ایڈیٹر ہیں ان تمام حضرات سے نہ صرف نیاز حاصل ہوا بلکہ بعض لوگوں سے علمی موضوعات پر سوالات کئے گئے جن کے جوابات ریکارڈ ہیں۔ یہاں پر ہم مولانا اسرار احمد جو تنظیم اسلامی کے بانی و امیر ہیں ان کا انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔

س۔ قرآن کریم کی آیت "ونادی اصحاب الاعراف رجالا یعرفونهم بسیماهم" کا کیا مفہوم ہے، اعراف سے کیا مراد ہے؟

ج۔ اس مسئلہ میں میری وہی رائے ہے جو جمہور مفسرین کی ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہونگی، جنکو جنت میں ابھی داخلہ نہیں ملے گا۔ وہ جنت کے امیدوار رہیں گے اعراف سے مراد یہ ہے کہ جنت و دوزخ کے مابین ایک دیوار ہوگی جس پر وہ بیٹھ کر دونوں طرف کا منظر دیکھیں گے جیسا کہ اصلاحی صاحب نے لکھا ہے۔ یہ لوگ ایک طرف تو عذاب جہنم کا مشاہدہ کرینگے جس سے پناہ مانگیں گے اور دوسری طرف جنت

کی قابلِ رشک زندگی کا جائزہ لیں گے تو انھیں
خداوند قدوس کی قدرت کا احساس ہوچکے
اور یہ بھی احساس ہو کہ وہ کتنا بڑا کرم فرما ہے اور
اصل یہ اپنے اعمال کی بنیاد پر جنت کے مستحق
نہیں ٹھہریں گے لیکن پھر بھی اللہ کے فضل و کرم
سے انھیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔

س۔ سورۂ یٰسین میں قالوا یٰویلنا
من بعثنا من مرقدنا ۔۔ آیا ہوا ہے۔
اس آیت کریمہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ
گویا مردوں کو عذابِ قبر نہیں ہوگا، روزِ قیامت
پکاریں گے کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں
بیدار کر دیا، جب کہ تمام احادیث شریفہ
میں یہ بات موجود ہے کہ عذابِ قبر لازمی ہے تو
تطبیق کی کیا صورت ہے۔

ج۔ میں عذابِ قبر کا قائل ہوں، صرف احادیث
کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرآن کریم کی بنیاد پر ارشادِ
ربانی ہے یضاعف لہم العذاب یوم القیامۃ
روزِ قیامت ان پر عذاب دوگنا کر دیا جائے گا
جس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے بھی ان
پر عذاب کی کوئی کیفیت تھی۔ اس طرح کے اور نشانات
بھی ملتے ہیں اور احادیث نے اسکی صراحت کر دی ہے
جس آیت سے تم بحث کر رہے ہو اسکا مطلب یہ ہے
کہ عالم برزخ میں جو عذاب ہو رہا ہوگا اس کی

تفاصیل تو ہمیں معلوم نہیں البتہ بعث بعد الموت
ان پر عذاب جسم کے ساتھ ہوگا، کس نے ہٹا دیا
ہماری خوابگاہوں سے؟ یہاں پر صرف روح کا تعلق
نہیں ہوگا بلکہ جسم و روح دونوں کا ہوگا۔ لہٰذا یہ
الفاظ پناہیں منظر رکھتے ہیں۔ عالم برزخ میں
مردوں کی حالت نیم خوابیدہ کی ہوگی اسکو پوری
طرح ہم بیداری بھی نہیں کہہ سکتے اور پوری
طرح سے مدہوشی بھی۔ اس لیے بعث بعد الموت
کے بعد جو عذاب ہوگا وہ پورے ہوش کے ساتھ
ہوگا، اسی لئے وہ کہیں گے کہ کس نے ہماری
خوابگاہوں سے ہمیں جگا دیا۔

س۔ سورۂ یٰسین میں ہے وما علمناہ الشعر
وما ینبغی لہ ۔۔ آیا ہے اس کا ترجمہ
بتادیں کرم ہوگا اور کیا مولانا مودودی کا یہ ترجمہ
کہ ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا، درست ہے

ج۔ مولانا کا یہ ترجمہ بھی درست ہے، اس
میں امپرومنٹ کی گنجائش ہے ویسے اگر یہ کہا جاتا
کہ ہم نے اسے شعر کہنا نہیں سکھایا تو اچھا ہوتا
مولانا نے لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ احادیث میں بھی
یہ بات موجود ہے کہ شاعری کے ساتھ آپ کو طبعی
مناسبت نہیں تھی، ویسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے اچھے اشعار پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے لیکن
جب اسے نقل کرتے تو شعر کا وزن برقرار نہیں

رہتا۔

س۔ تصوف کا اسلام سے کیا تعلق ہے کیا
دورِ حضور کریم اور صحابہ کرامؓ میں اسکا وجود تھا،
اگر کہا جاتا ہے کہ یہ ایران کی ایجاد ہے تو درست
ہوگا۔

ج۔ یہ مسئلہ اصل میں بہت تفصیل کا طالب
ہے اس دور میں جو چیز تصوف کے نام سے جانی
جاتی ہے کچھ عملی طریقے ہیں جنکو ان مقاصد کے
لئے ایجاد کیا ہوا ہے قرآن و سنت کے مطابق
ہیں اور اسے قرآن کریم اور احادیث میں درجہ احسان
سے تعبیر کیا گیا ہے اسکے لئے صوفیاء نے جو
طریقے اختیار کئے ہیں وہ انکی ایجاد بھی ہے
اور اجتہاد بھی، جہاں تک عملی طریقوں کا سوال
ہے تو اسکے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہے
کہ یہ صحیح ہیں کہ غلط، مفید ہیں کہ نہیں لیکن
جہاں تک تصوف کا اصل مقصد ہے وہ یہ ہے
کہ اللہ کے ساتھ محبت کا رشتہ ہو، اسکے
اور اخلاص فی العمل کے جذبات ہوں اور آدمی
آخرت کا طالب بنے، تصوف کا اصل مقصد
یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی تاثیر
جاری نہ رہی تو اسکے حصول کے لئے صوفیہ
نے یہ طریقے ایجاد کئے اور دوسری بات یہ ہے
کہ آنحضور نے صحابہ کرامؓ کی زندگی میں جو

ایک چیز پیدا کی تھی وہ چیز انقلابی جدوجہد تھی
جس میں وہ ہمہ آن ہمہ تن مشغول رہتے تھے
بعد میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی اور
مسلمانوں کا ایک معاشرہ وجود میں آیا۔ اس
میں حکمران اعلیٰ درجے کے نہ رہے، پھر بھی اسلامی
قانون موجود تھا۔ اس میں ویسی انقلابی جدوجہد
کا کوئی ذریعہ نہ تھا یہ دوسرا خلا رہ گیا تھا، میں
ان دونوں کی وضاحت کرتا ہوں، ایک حضورؐ کی صحبت
کا اثر جو زمانہ مابعد میں نہ رہا دوسرے وہ انقلابی
جدوجہد، کشمکش، جہاد، مجاہدہ، ایثار، قربانی،
یہ تمام چیزیں دورِ حضورؐ اور عہدِ صحابہ کرام
کے دور میں تھیں، یہ کیفیات زمانۂ مابعد میں
نہ باقی رہیں، اس لئے اسلامی حکومت میں ذکر
کے نئے طریقے، اسلوب اور مذاکرے وغیرہ کے
صوفیاء نے اپنے تجربے سے مفید سمجھ کر ایجاد
و استعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں اس دور میں
پھر بھی اصل طریقۂ نبوی کو لینا ہوگا تاکہ وہ انقلابی
جدوجہد اور کشمکش پیدا ہو اور ہم تن من سے
حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ یہ طریقہ دراصل
طریقہ ہائے ذکر اور مجاہدوں کی ایجاد کی جگہ سے
کئی چیز تھی جسے بریلوی نے جہاد کے باب
میں ایجاد کیا تھا جو طریقے انھوں نے تصوف
کے بارے میں ایجاد کئے ان میں سے ایک

شاہ عبد العزیزؒ سے بیعت ہے۔ انسان جو بیعت کرتا در اصل وہ طریقۂ محمدیہ کا پابند ہوتا ہے۔ طریقۂ محمدیہ جہاد، قتال اور اللہ کے دین کے لئے قربانی پیش کرنا ہی تصوف ہے

س۔ آپ نے اسلامی تصوف کے لئے کوئی کام کیا؟

ج۔ اس موضوع پر تو میرا کوئی کام نہیں ہے ویسے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید ہی کا جو میرا درس چلتا ہے وہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے اور درس قرآن کے دوران جہاں اس طرح کے مقامات آتے ہیں انکی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

س۔ صوفیائے کرام کا نظریہ وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود میں کیا فرق ہے؟ کیا اسلامی رو سے یہ صحیح ہیں؟

ج۔ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان فرق بیان کرنا بہت مشکل ہے میرے نزدیک شاہ ولی اللہؒ کی رائے درست ہے کہ ان دونوں کے درمیان در اصل ایک تعبیر کا فرق ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں اور ان دونوں کو درست سمجھتا ہوں لیکن میرے نزدیک یہ مسئلہ دین کا نہیں ہے یہ فلسفۂ وجود کی بحث کا ہے اور اس کا اصل تعلق واجب الوجود اور ممکن الوجود درمیان ربط کی کیا نوعیت یا حادث اور قدیم کے مابین کیا ربط ہے دونوں کے درمیان فرق بیان کرنا بہت محال ہے، جب فرق کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکی دوسری مثال میرے سامنے مسئلہ تقدیر ہے ایک طرف تو ایمانیات کے اجزاء لازمی میں شامل ہے جیسے وہ امنت باللہ .... وشرہ من اللہ تعالیٰ۔ لیکن اس پر گفتگو سے منع کیا گیا ہے، جب اس مسئلہ پر بحث کی جاتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ سمجھ میں نہ آسکے، اگر یہ ماورائے عقل ہوتی تو انسان کو اس پر ایمان لانے کا مکلف نہ بنایا جاتا، سمجھ میں تو آتا ہے لیکن بیان میں نہیں آتا اسی طرح مسئلہ وحدۃ الوجود ہے کہ سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی میرے نزدیک جو آسان ترین تعبیر ہے وہ ہے جو مناظر احسن گیلانیؒ نے "الدین القیم" میں کی ہے۔ ذات باری تعالیٰ اور کائنات یا حادث اور قدیم کے فرق کو انہوں نے اس مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ اپنے ذہن میں تاج محل کا تصور لائیں، جب اپنے ذہن میں تاج محل کا ایک ہیولیٰ بنا لینگے تو یہ خود آپ کے ذہن کی تخلیق ہوگی، اسکا اپنا علاحدہ کوئی وجود نہیں ہوگا اور یہ اسی وقت تک رہے گا جب

تک آپ کی توجہ تاج محل پر مرتکز رہے گی یہ آپ ہی کے اندر ہے آپ اسکے باہر ہیں اندر بھی ہیں اوپر بھی ہیں نیچے بھی آپ ہی ہیں، یہاں پر در اصل تاج محل کا وجود نہیں ہے، بہرحال اس اعتباری اور عارضی سے وجود کو مان لیں تو اسکے ساتھ جو آپ کا تعلق ہوگا وہ ہے "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" ہو اللہ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اسکا اپنا کوئی الگ وجود نہیں ہے، بالکل ایسے ہی اس کائنات کا حقیقی وجود نہیں ہے، حقیقی وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کا عارضی وجود ہے مستقل بالذات وجود اسکا ہے ہی نہیں۔ عوام اس مسئلہ سے کنفیوز کر جاتے ہیں اور اسے پینتھی ازم یا ہمہ اوست تصور کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ اسکے برعکس ہے کائنات کو حقیقی بالذات خالق کو اس میں حلول نہیں سمجھا جاتا بلکہ اللہ کو اصل مانتے کائنات کو اسمیں محو سمجھا جاتا ہے۔ اگر سید شیخ احمد بریلویؒ کا ایک جملہ مجھے صحیح یاد آسکے کہ "ایں ہستی صنعت باری تعالیٰ است کہ موجود را معدوم رای نماید" یک معدوم شے جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے اسکے وجود سے اسے حقیقت دکھتی ہے بلکہ یہ کائنات اصل میں وجود نہیں ہے۔

س۔ تصوف میں "رقص و سماع" جائز ہے؟ اگر نہیں تو پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ اسکے کیسے قائل تھے۔

ج۔ سماع کے متعلق جہاں تک میرا خیال ہے۔ ہمارے صوفیاء مزامیر کے بغیر قائل ہیں اگر اللہ کی حمد اور نعت رسولؐ وغیرہ ترنم کے ساتھ پڑھی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے باب میں جو روایات ہیں اسمیں تضاد ہے۔

س۔ آپ کا جماعت اسلامی سے کبھی کوئی ربط رہا تو کس نوعیت کا؟ کیا "تحریک اسلامی" سے آپکو اختلاف ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ نے "تنظیم اسلامی" کی کیوں بنیاد ڈالی؟ جماعت اسلامی میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جماعت اسلامی کے ساتھ تو میرا تعلق ایک بچے اور ماں کا ہے، اسی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، میرا ذہن اسی کا تعمیر کردہ ہے، لیکن ایک سانحہ ہوا انتخابات کا اور اس سے بالاتر ہوتی ہیں تنظیمیں اور جماعتیں اور جماعتوں سے بالاتر ہوتی ہیں تحریکیں میرے نزدیک برصغیر میں ایک ہی جماعت ہے جسکی ابتداء کی تھی مولانا ابو الکلام آزاد نے سنہ ۱۲ء سے سنہ ۲۰ء تک کا

جو دور ہے وہ الہلال اور البلاغ کا دور ہے انھوں نے حزب اللہ قائم کی تھی بعد میں بد دل ہو کر اسے چھوڑ دیا، اسکی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اور کانگریس میں بھرتی بھر وقت شرکت اختیار کر لی وہ جہاز حریت کے میدان میں اتر گئے، اسی کو لے کر مولانا مودودی اٹھے اسکا احیاء کیا۔ انکا ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء کا دور ہے، میرے نزدیک یہ ان کا سب سے اہم ترین دور ہے، جس میں وہ اصولی، انقلابی اور اسلامی تحریک کو لیکر چل رہے تھے ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد انکا رخ قومی سیاست کیطرف مڑ گیا وہ انتخابی دلدل میں پھنس کر رہ گئے جس سے نکلنا انکو نصیب نہ ہو سکا، آخری عمر میں وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے رہے کہ اس راستے سے اسلامی نظام قائم کرنا مشکل ہے لیکن اس وقت جماعت اسلامی اس دلدل میں جا پھنسی ہے اب دوسری مرتبہ اس تنظیم کی احیاء کی کوشش میں کر رہا ہوں جو "تنظیم اسلامی" کے نام سے ہے۔

س۔ کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء و رسل سے افضل ماننا عقیدہ میں داخل ہے؟ اگر نہ مانا جائے تو کیا حرج ہے قرآن کریم کی آیت "فضلنا بعضهم على بعض" کا کیا مطلب سمجھتے ہیں؟

ج۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ آپکو افضل الانبیاء ماننا عقیدے کا لازمی جزو ہے کہ نہیں بہر حال میں مانتا ہوں، جس آیت سے تم بحث کر رہے ہو اسکا مطلب یہ ہے کہ جزوی اعتبار سے بعض انبیاء کو آپ پر فضیلت ہو سکتی ہے لیکن مجموعی اور مطلق فضیلت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء و رسل پر حاصل ہے

س۔ "انجمن خدام القرآن" کے قیام کا کیا مقصد ہے؟ اب تک اس سے کیا کچھ ہوا ہے؟

ج۔ میں ایک زمانہ حزب اللہ سے جڑا رہا ہوں، جہاں تک مولانا مودودی کے طریقہ کار کا حال ہے تو اس میں ایک امپرومنٹ کی ضرورت ہے، ویسے اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کوئی اپنی تحریروں اور تصانیف کو دعوت اسلام کے لئے بنیاد بناتے اصل میں اسلامی تحریک کے لئے جو دائمی لٹریچر ہے وہ قرآن مجید ہے۔ یہی ہے عوام تک دعوت دینے کا ذریعہ، قرآن کریم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آلۂ انقلاب رہا ہے اور اسی کے ذریعہ

آپ نے دعوت دین کا کام کیا۔ جسکے لئے تین منہاج اپنا کر میں ۱۹۶۵ء سے کام کر رہا ہوں میں نے اسکے لئے مطالعہ میں بہت سی کتابوں کو منتخب کیا، درس قرآن شروع کیا جسکی وجہ سے ہم خیال لوگوں کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا پھر میں نے سوچا کہ اسکے لئے ادارہ کا قیام لازمی ہے تاکہ اس طرح کی کتابیں شائع کی جائیں پھر میں نے "قرآن اکیڈمی" کی بنیاد ڈالی کہ جسکی وجہ سے قدیم و جدید کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو گا تاکہ جدید علوم حاصل کرنے والوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دی جائے تو ان دونوں مالی وسائل کی بہت ہی تھی تو ۱۹۷۵ء میں قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ویسے تو اسکو قائم ہوئے بارہ سال ہو گئے لیکن ابھی دو سال سے کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ پہلا پیچ ہم نے جو لیا تو جو اول کا لیا تھا جو ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی پاس تھے تو انکو دو سال ہم نے عربی کی تعلیم دی ہے۔ ان طلبا سے بعض ایسے ہیں جن سے ہماری توقع ہے کہ وہ تحقیقی و تخلیقی کام کر سکیں گے، جبکہ یہ محسوس کیا کہ تمام آدمیوں کے اندر تخلیقی صلاحیت نہیں ہوتی ہے اس لئے ہر آدمی کو فیلو اور رفیق کی حیثیت سے اس ادارہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اب جسے عمومی درس دینا شروع کیا ہے جو ان نوجوانوں کا پیچ ہے، یہ ڈیڑھ سال کا کورس ہے، اس میں گریجویٹ، ایم۔ اے اور اس سے بھی اوپر ہیں، اور اب ہم جیسے یہ سمجھیں گے کہ یہ تحقیقی و تخلیقی کام کر سکتے ہیں تو انہیں اس ادارہ میں فیلو کی حیثیت سے رکھیں گے

س۔ موجودہ حکومت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ "نفاذ شریعت اسلامی" میں وہ کہاں تک کام کر چکی ہے۔ ہم یہاں سنتے رہتے ہیں کہ سودی بینکاری ختم ہو چکی ہے "نظام زکوٰۃ" تیزی سے ملک میں پھیل رہا ہے۔ اور تحریک "نظام صلوٰۃ" کیوجہ سے سرکاری دفاتر میں نماز باجماعت ہونے لگی ہے کیا حقیقت ہے؟

ج۔ میرے خیال میں اس میں حقیقت نمک کے برابر ہے، اور سب کا سب افسانہ ہے، صرف اسلام کے نام پر غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے ہیں اور لوگوں کو ناجائز استعمال کیا جا رہا ہے اور آپ لوگ★ اس سے تو عوام کے اندر مایوسی اور بد دلی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے جس سے خوفناک نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ بہر حال آنے والا مورخ

[illegible]

★ [illegible]

اس دور کی قلعی کھولے گا۔ دوسرا میرا اپنا خیال ہے
کہ گزشتہ حکومت نے سوشلزم کو بدنام کیا
ہے اور موجودہ حکومت اسلام کو بدنام کر
رہی ہے۔

س۔ آپ مجلس شوریٰ سے کیوں مستعفی
ہوگئے؟

ج۔ میں مارشل لا حکومت کو بہتر و صحیح
نہیں سمجھتا لیکن ملک میں بالفعل حکومت
کی حیثیت سے قائم ہے۔ بہرحال انکی بغاوت
تو نہیں کی ہے لیکن جہاں تک خیرخواہی اور موقع
کا تعلق ہے۔ "الدین النصیحۃ" مسئلہ
والی حدیث کی رو سے صحیح ہے، یہ سمجھ کر تو
ضیاء نے مجھے اپنی مرکزی حکومت میں شامل
ہونے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے شامل ہونے
سے انکار کر دیا۔ اس میں شامل ہونے کا مطلب یہ
ہے کہ میں انکی حکومت کو تسلیم کرتا۔ جب انہوں نے مجلس شوریٰ
کا کانسپٹ دیا تو میں نے اس میں شمولیت کی دعوت
کو تسلیم کر لیا کیونکہ یہ کام پہلے بھی میں اپنی
تقاریر و تصانیف میں تنقید و مشورے کا کام
کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہی کام قریب سے
کرنے کو ملے تو اور بہتر ہے لیکن وہاں جاکر
مجھے دو باتوں سے بیزاری پیدا ہوئی۔ ایک
تو شوریٰ کے جو رولس اور پروسیجر ہیں وہ
بالکل پارلمنٹ جیسے ہیں اور دوسری بات
یہ کہ جب انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کیا
تو ضیاء صاحب نے کہا کہ یہی سیاسی عمل
کا آغاز ہے جس سے میں نے یہ محسوس
کیا کہ جو اس میں داخل ہے وہ ان کا پولیٹیکل
الائیڈ ہے اس لئے اس سیشن سے میں مستعفی
ہوگیا۔

س۔ عورتوں نے کیوں آپ کے خلاف
مظاہرہ کیا تھا؟

ج۔ یہ مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین ہیں
جو یہ چاہتی ہیں کہ ہمارا امام ہو اور ہم ٹی۔ وی۔
پر چلی جائیں تو میں نے کہا کہ یہ شرعی حیثیت
سے بہتر نہیں کہ عورتیں ٹی۔ وی۔ پر آجائیں۔
اسی بات پر میرے خلاف مظاہرہ ہوا تھا
ضیاء صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ میری
جگہ ہوں تو کیا کریں گے۔ میں نے کہا تمام عورتوں
کو نشستیں ویر گھر بٹھا دوں گا۔

س۔ مدرسۃ الاصلاح اور مولانا فراہیؒ کے
بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ج۔ میرے تاثرات بہت اچھے ہیں اور
مدرسۃ الاصلاح عمدہ ادارہ ہے۔ مولانا فراہیؒ
کی تفسیر مقدمہ نظام القرآن سے بہت
استفادہ کیا ہے۔ قدیم تحریروں میں سے

چار منبع ہیں جن سے میں نے استفادہ کیا
ہے جن میں سے ایک تحریکی تفسیر
مولانا مودودیؒ اور ابوالکلام آزاد کی ہیں دوسرا
نظم قرآن اور تفسیر قرآن بالقرآن کے حوالے
مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی آتے ہیں اور
متقدمین میں مولانا شیخ الہند کا ترجمہ قرآن
اور مولانا شبیر عثمانیؒ کے حواشی سے میں
نے استفادہ کیا ہے اور آخر میں جو ایک اہم
باب ہے علامہ اقبالؒ آتے ہیں جنکی
طرف رفیع الدین صاحب نے اشارہ کیا ہے
تو یہ چار سورس ہیں جن سے میں نے فائدہ
اٹھایا ہے تو میرے نزدیک مولانا فراہیؒ کا
کا مقام بہت اونچا ہے۔ خاص طور سے جس
دور میں نیشنلزم آیا تھا یہ دور سرسید
کا ہے مولانا فراہیؒ اسی دور کے ہیں۔ اسی
حلقے میں رہے، کوئی بھی شخصیت ہو اپنے
ظروف مکانی و زمانی سے محفوظ نہیں رہ
سکتی۔ صرف انبیاء اس سے محفوظ رہ سکتے
ہیں۔ ان پر اللہ کی خاص عنایت ہوتی
ہے، مولانا فراہیؒ پر بھی اسکا اثر رہا
اور معجزات کی تعبیر جس طریقے سے علامہ
سرسید نے کی ہے وہ "معجزہ لیجنڈ
والا ایک تصور تھا تو انہیں ہلکی سی جھلک
انکے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ احادیث سے
استغنا اور عدم اعتنا والا تصور مولانا فراہیؒ
کے یہاں بھی ہے۔ یہ چیز مولانا اصلاحی
کے یہاں حد سے تجاوز کر گئی ہے تو میں تو
اس باب میں مداہنت نہیں کر سکتا اور
اور حد رجم کے باب میں اصلاحی صاحب
کی جو رائے ہے وہ منکرین حدیث کی
صف میں اس رائے کی بنا پر جا کھڑے
ہوئے ہیں۔ مولانا فراہیؒ ویسے سرسید
کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن
پانچ فیصد اس کا اثر مولانا پر رہا۔ مثلاً
متکلمین نے جواب دینے میں اسلامی
چیزوں کو مد نظر رکھا لیکن وہ بھی اس فلسفہ
سے متاثر ہوکے رہے۔

س۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ مارکسزم
سے متاثر تھے؟ کیا یہ نظریہ درست ہے؟

ج۔ میرا خیال ہے کہ یہ نظریہ صحیح ہے
اور انکے یہاں مارکسزم ہے اور یہ میں کہونگا
کہ انکے اندر اگر اللہ کا تصور ہوتا ہے
تو وہ ایک بلند نظریہ ہے۔ معاملہ رہ جاتا
ہے معاشی مسئلہ کا یہ یقیناً اسلام
کے خلاف ہے اور سوشلزم کا جو اصل
مقصد ہے کہ امیر و غریب کے درمیان

کوئی خلیج نہ حائل ہو اور پیداوار کے وسائل و ذرائع پر انکے قبضے و غلبے نہ ہو جائیں کہ ان پر صرف انھیں کے اثرات باقی رہیں، تو یہ نظریہ تو اسلامی رو سے بھی درست ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے، "کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم"، اسلام اسکو اپنے طرز سے پیش کرتا ہے، رہا مارکس تو وہ اس میں اس لئے بھٹکتا ہے کہ اسکے پاس کتاب مبین کی ہدایت و روشنی نہ تھی مثلاً میرے نزدیک مضاربت حرام ہے اور یہ رائے مثلاً قدما ائمہ [illegible] ہے۔ امام اعظمؒ اور امام مالکؒ دونوں کے یہاں ہر قسم کی مضاربت حرام ہے۔ زمین جسکی ہے وہ خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دیدے۔

س۔ کیا علامہ اقبال کچھ پیتے بھی تھے؟

ج۔ یہ بات انکی جوانی کی ہے اور جوانی میں تو انھوں نے بہت کچھ کیا ہے، وہ بہت رنگین مزاج تھے، اور عمر کا آخری حصہ تو نہایت سادہ اور ایک عابد و زاہد کے مانند گزرا ہے۔

س۔ کیا علامہ اقبال کے تمام نظریات سے آپ اتفاق رکھتے ہیں۔

ج۔ علامہ اقبال کے بہت سے نظریات کو غلط سمجھتا ہوں لیکن اب ہم قرآن کریم اور دین کے مختلف پہلوؤں کی تعبیر جس قدر علامہ اقبال کی ہے میں اسکے ہمسر کسی اور شخصیت کو نہیں سمجھتا اور انکی بعض چیزوں سے مجھے شدید اختلاف ہے، انکو میں سمجھے سے رہا البتہ سب چیزیں ان کو سمجھتے بیانات کی میں آتی ہیں میں لکھاڑ آدمی نہیں ہوں۔

بقیہ: حیاتِ نو — تنقید و تحلیل

نمبر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔

چلتے چلتے! حیاتِ نو کا دوبارہ پابندی سے اجراء، کارکنان ادارہ خصوصاً مدیر کی لگن اور خلوص کی غمازی کرتا ہے، بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ راہ حق کے ان متوالوں کو ہمت و استقلال عطا فرما اور حیاتِ نو کو توانائی تابندگی سے ہم آغوش کر۔ آمین

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے
(اقبال)

عبید اللہ فہد فلاحی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر بنت الشاطی کی تفسیر بیانی کا مطالعہ

دوسری اور آخری قسط

اسلوب قرآن سے واقفیت ناگزیر ہے

موصوفہ کا خیال ہے کہ قرآن کے ادب و اسلوب اور مفردات و تراکیب سے واقفیت ہر اس شخص کیلئے ناگزیر ہے جو قرآن سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو چاہے اس کا مقصد قرآن سے فقہی و کلامی مباحث کا استخراج ہو یا نصائح و مواعظ کا مجموعہ وہ اکٹھا کرنا چاہتا ہو، وہ معاشرتی، اجتماعی، سماجی، لغوی یا ادبی و بلاغتی مسائل سے تعرض کرنا چاہتا ہو یا عام اور سادہ انداز میں قرآن کی تفسیر کرنا چاہتا ہو، ہر شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ پیش نظر مقصد کی تکمیل کیلئے قرآن کی زبان و بیان پر عبور حاصل کرے، اس کے نظم و اسلوب کو سمجھے اور اس کے ادبی کمالات اور فنی محاسن کا ادراک حاصل کرے اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ وہ عربی ادب کا سلیم اور صحت مند ذوق رکھتا ہو، اور تعبیر و تفسیر کے مدرکات سے اچھی طرح واقف ہو۔ (۲۹)

ماحول و زبان، لہجہ و اسلوب، تہذیب و فن کے تنوع اور اختلاف کے باوجود جس طرح مسلمان قرآن کو عقیدہ و دین کا منبع اور ثقافت و سیاست کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں اور اس سے انکار کو دین سے انحراف گردانتے ہیں اسی طرح اگر اس کتاب مبین کے مطالعہ و تحقیق اور فہم و تفہیم کی بنیاد آزادانہ صحت مند طریق پر رکھی جائے اور عربی ادب کی خصوصیات اور زبان و بیان کی نزاکتوں کو پیش نظر رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو وحدت امت کی طرف مزید پیش قدمی ہو سکے گی اور فکر و خیال کا انتشار بڑی حد تک کم ہو جائے گا، مختلف گروہ بندیوں

اور دھرے بازیوں کی گنجائش نہ رہے گی اور نئی بحث انگیز آفرینیاں اور موشگافیاں بند ہو جائیں گی۔ موصوف کے خیال میں پھر مختلف تاویلات اور تفاسیر کا دروازہ از خود بند ہو جائے گا اور نظم و اسلوب کی روشنی میں کسی ایک تاویل کو اختیار کر کے اتحاد و یک جہتی کو مزید فروغ دیا جا سکے گا۔

قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے

ڈاکٹر بنت الشاطی اسلاف کے اس طرز تفسیر کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر کیلئے سب سے پہلے خود قرآن ہی کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ جو بات ایک جگہ مجمل ہے وہ دوسری جگہ تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔ واقعہ کا جو پہلو ایک جگہ دبتا نظر آتا ہے وہ دوسری جگہ ابھار کر پیش کیا گیا ہے، جو الفاظ بظاہر مبہم اور غیر واضح نظر آتے ہیں ان کے دوسرے استعمالات سے ان کے معانی بے نقاب ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن خود کہتا ہے کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر۔

چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ مطالعہ قرآن کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک موضوع سے متعلق قرآن میں جو آیات آئی ہیں ان سب کو یکجا کیا جائے۔ الفاظ و اسالیب کا جو معروف استعمال ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے اور ہر لفظ کی لغوی تحقیق بھی ہو۔ اس کے بعد ہی ہم قرآن کے اصل مدعا تک پہونچ سکیں گے اور اس کی حقیقت کو پا سکیں گے۔ اس کے برعکس تفسیری ذخیروں میں یہ روش اختیار کی گئی ہے کہ ایک ایک سورہ کو سیاق و سباق سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور پورے قرآن کے پس منظر میں اس کی تفہیم تقریباً مفقود ہے یہی وجہ ہے کہ ہم الفاظ کے قرآنی معانی تک پہونچنے سے عاجز رہتے ہیں اور ان کے اسلوبی مظاہر اور ادبی محاسن کا سراغ نہیں لگا پاتے۔ ۲۹

قدیم تفاسیر سے یہ شکایت عام ہے۔ دور جدید کے اکثر مفسرین نے اس طرح کی تنقیدیں کی ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا ابو الکلام آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "قرآن کی صحت فہم کیلئے عربی لغت و ادب کا صحیح ذوق شرط اول ہے لیکن مختلف اسباب سے جن کی تشریح محتاج تفصیل ہے یہ ذوق کمزور پڑتا گیا یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب مطالب میں بے شمار الجھاؤ محض اس لئے پڑ گئے کہ عربیت کا ذوق سلیم باقی نہیں رہا اور جس زبان میں قرآن

نازل ہوا تھا اس کے محاورات و مدلولات سے یک قلم بعد ہو گیا۔" (۳۰)

ڈاکٹر بنت الشاطی آگے اس امر پر بڑا زور دیتی نظر آتی ہیں کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلے اس کے ادب کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے اور جب اس نہج سے مطالعہ کیا جائے گا تو تفسیر کی کتابوں میں منقول مختلف تاویلات کی کمزوری واضح ہو سکے گی اور پتہ چلے گا کہ کس طرح قرآن کی آیات کو وہ معانی پہنائے گئے ہیں جن سے خود قرآن انکار کرتا ہے اور تکلف و وضعیت کے خول میں کس طرح اس جمال و جلال کو مقید کر دیا گیا ہے۔

شان نزول

شان نزول کے سلسلہ میں مفسرین کو عام طور سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ عام طور پر ہر آیت کے ذیل میں کوئی نہ کوئی واقعہ بلکہ بسا اوقات متعدد واقعات بطور شان نزول بیان ہوتے ہیں اور ان کو تسلیم کر لینے سے پورے قرآن کے نظم و تسلسل کی بات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ جب ہر آیت کسی خاص واقعہ سے متعلق ہے تو قرآن میں ربط، انتظام اور تسلسل کہاں رہا۔ حضرت امام رازی کو اپنی تفسیر مفاتیح الغیب میں یہی اشکال پیدا ہوا چنانچہ سورہ انعام کی تفسیر میں واذا جاءک الذین یؤمنون بآیاتنا میں وہ لکھتے ہیں کہ "میرے سامنے یہاں ایک سخت اشکال ہے وہ یہ کہ لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ یک دفعہ نازل کی گئی ہے۔ جب معاملہ یوں ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سورہ کی ہر آیت کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کے نزول کا سبب فلاں واقعہ ہے۔" (۳۱)

اس کا جواب علامہ فراہیؒ نے یہ دیا ہے کہ جس وقت جو سورہ بھی نازل کی گئی ہے اسی غرض سے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح و تشریح ہیں ان کی توضیح و تشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ کسی قسم کا التباس نہ رہ جائے بعینہ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات و مقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے اور بسا اوقات وہ ایک خاص معاملے کا ذکر اگرچہ نظر انداز کر جاتا ہے لیکن اس کا کلام اس طرح کے تمام احوال و معاملات پر حاوی ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے۔ (۳۲)

چنانچہ علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ "زرکشی برہان میں کہتے ہیں کہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی

ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے اس سے مقصود نقلِ واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آیت اس زمانے میں نازل ہوئی ہو جس زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا ہے"۔ (۳۳)

شان نزول کے سلسلے میں یہی مسلک ڈاکٹر بنت الشاطی کا بھی ہے چنانچہ سورہ والضحیٰ کی تفسیر میں وہ لکھتی ہیں کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ اس سورہ کا سبب نزول یہ ہے کہ ملائکہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا سلسلہ بند ہو گیا اور کہنے والے کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے رب نے یکہ و تنہا چھوڑ دیا ہے۔ یہ قول کس کا تھا؟ اس پر متعدد روایات نقل کرنے کے بعد آخر میں لکھتی ہیں:

ولا نقف عندما اختلفوا فيه فاسباب النزول لا تعد وان تكون قرائن مصاحبة للنص وهي باعتراف الاقدمين انفسهم لا تخلو من وهم والاختلاف فيها قديم وواقع عند الاصوليين أن العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب (التفسير البياني ص: ۱۴۰)

اس اختلاف روایات پر توقف کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اسباب نزول کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ نص کے نزول کے حالات و قرائن ہوتے ہیں جن میں وہ نص نازل ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں قدماء کا اعتراف ہے کہ اس میں غلطی کا امکان ہے۔ یہ اختلاف قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اصول تفسیر کے ماہرین کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ لفظ کا عموم قابل لحاظ ہے نہ کہ وہ مخصوص سبب جس کی وجہ سے آیت نازل ہوئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیق بھی یہی ہے وہ فرماتے ہیں:

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی ایک قصہ کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصہ کو اس آیت کیلئے سبب نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزول قرآن سے مقصود اصلی نفوس البشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے اس لئے آیات مباحثہ کے نزول کیلئے مکلفین میں عقائد باطلہ کا وجود اور آیات احکام کیلئے ان میں اعمال فاسدہ اور مظالم کا عام

ہونا اور آیات تذکیر کیلئے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت اور اس کے بعد ہولناک واقعات کے بیدار نہ ہونا اصل سبب ہوتا ہے۔ خاص خاص واقعات جن کو بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے اسباب نزول میں انہیں چنداں دخل نہیں ہے مگر صرف بعض آیات میں جہاں پر کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو کیونکہ سننے والے کے دل میں اشارے سے ایک گونہ انتظار پیدا ہو جائے گا جو بدون قصہ کی تفصیل معلوم کئے زائل نہ ہوگا بدیں وجہ مفسر پر لازم ہے کہ ان علوم تفسیر کی اس طرح تفصیل کریں کہ خاص خاص واقعات کے بیان کرنے کی تکلیف نہ کرنی پڑے۔" (۳۴)

ایک دوسری جگہ شاہ صاحب اس موضوع پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"جان لینا چاہیئے کہ حضرات صحابہ اور تابعین مشرکین و یہود کے مذاہب اور ان کی جاہلانہ عادات کے بارے میں قصہ ہائے مخصوصہ اکثر بیان فرماتے ہیں کہ وہ عقائد و عادات زیادہ روشن ہو جائیں اور ایسے موقعہ پر وہ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ نزلت الآیۃ فی کذا۔ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں آیت اس طرح کے واقعات کی نسبت نازل ہوئی ہے جو ان کی مراد اس سے عام ہوتی ہے کہ سبب نزول وہی واقعہ ہو یا اس کے مانند کوئی اور واقعہ یا آیت اس واقعہ کے قریب نازل ہوئی ہو۔ اس صورت خاص کے اظہار سے ان کا مقصد اس کی تحقیق کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ فقط یہ غرض ہوتی ہے کہ یہ صورت ان امور کلیہ کیلئے (جن کا اظہار و بیان ضروری ہے) ایک اچھی تصویر ہے۔ (۳۵)

آگے دوسری فصل میں مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "اس فقیر کے نزدیک یہ محقق ہوا ہے کہ حضرات صحابہ و تابعین اکثر فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں فلاں واقعہ میں نازل ہوئی مگر ان کا مقصود صرف آیت کے افراد و مصداق کی تصویر اور بعض ایسے مخصوص حادثات کا ذکر مقصود ہوتا ہے جن کو آیت اپنے عموم حکم کی وجہ سے شامل ہے اس سے عام ہے کہ وہ واقعہ جس کو انہوں نے سبب نزول کہا ہے نزول آیت سے مقدم ہو یا مؤخر" (۳۶)

ان اقتباسات کی روشنی میں شان نزول سے متعلق تمام شبہات آپ سے آپ رفع ہو جاتے ہیں۔

بنت الشاطی کا طریقہ تفسیر

ڈاکٹر بنت الشاطی نے قرآن پاک کی آخری چند سورتوں

کی تفسیر میں جن امور کو مدنظر رکھا ہے ان کی تبیین
چند نکات میں اس طرح پیش کی جا سکتی ہے:

۱۔ سب سے پہلے مفردات کی تشریح کی
ہے اور الفاظ و اسالیب کے معنی متعین کئے ہیں
لیکن اس تعیین میں کلام عرب سے استشہاد
اور عام و معروف استعمالات کو سامنے رکھا
ہے اس لئے کہ موصوفہ کے خیال میں قرآن مجید
عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور عربی بھی آج
کے اخبارات و جرائد کی نہیں بلکہ امرؤ القیس
عمرو بن کلثوم، لبید بن ربیعہ اور زہیر اور حارث
بن حلزہ جیسے بلند پایہ شعراء اور قس بن ساعدہ
جیسے بے نظیر خطباء کی زبان ہے۔ اس لئے قرآن
کے اعجاز و ایجاز کا اندازہ کرنے کیلئے ان شعراء
و ادباء کے کلام کے محاسن و معایب کو سمجھنے
کا ذوق درکار ہے نیز قرآن معروف و مشہور
زبان میں اترا ہے اس میں شاذ و نادر اور نامانوس
معانی استعمال نہیں ہوتے ہیں اس لئے قرآن
مجید کے الفاظ و معانی کی تفسیر میں ان چیزوں
کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

سورہ بلد کی تفسیر کرتے ہوئے لا اقسم
بھذا البلد میں وہ کہتی ہیں کہ شعراء کے یہاں
قسم اور حلف مترادف الفاظ کی حیثیت سے
استعمال ہوتے ہیں اور وہ نابغہ، اعشی اور
علقمہ فحل کے بجائے شاس کے اشعار کو بطور
مثال پیش کرتی ہیں:

نابغہ کہتا ہے:

حلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ

اعشی کا شعر ہے:

حلفت لہ بالراقصات الی منی

شاس کہتا ہے:

حلفت بما ضم الحجیج الی منی

موصوفہ کا خیال ہے کہ ان تمام اشعار
میں حلفت، اقسمت کے مترادف کی حیثیت
سے استعمال ہوا ہے لیکن قرآن میں اس
مادہ کے استعمالات کے تتبع سے معلوم ہوتا
ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق ہے۔ حلف
کا لفظ جھوٹی قسم کھانے کے معنی میں آیا ہے
اور اقسام کا لفظ عام معنی میں۔ قرآن نے تیرہ
مقامات پر اس لفظ حلف کو استعمال کیا ہے
اور بغیر کسی استثناء کے ان سارے مقامات
پر جھوٹی قسم کے معنی میں مستعمل ہے۔ مثال
کے طور پر قرآن کہتا ہے:

ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ
إِلَّآ إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا (نساء: ۶۲)

اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے
ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو

صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ
تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔
یعنی ان منافقوں کو جب معلوم ہو جاتا
ہے کہ مسلمانوں کو ان کی منافقانہ حرکتوں کا علم
ہو گیا ہے اور اب ان کی باز پرس یقینی ہے
تو اس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین
دلانے لگتے ہیں حالانکہ وہ قسمیں جھوٹی اور بے
بنیاد ہوتی ہیں۔

اسی طرح موصوفہ کے نزدیک یہ امر بھی
قابل غور ہے کہ قرآن میں کہیں بھی حلف کی
نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی ہے بلکہ اس
طرح کے مواقع پر وہ قسم کا لفظ استعمال کرتا
ہے۔ (۲۸)

۲۔ دوسرا اصول انھوں نے یہ ملحوظ رکھا
ہے کہ کسی لفظ یا آیت کا مفہوم متعین کرنے
سے پہلے قرآن کے ان تمام مقامات کا سروے
کیا ہے جہاں وہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور
پھر پورے قرآن کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے
مفہوم متعین کیا ہے۔ ایک مثال اوپر گزر
چکی ہے۔ دوسری مثال سورہ والضحیٰ کی تفسیر
کی ہے جس میں ضحی کا مفہوم متعین کرتے وقت
وہ لکھتی ہیں:

قرآن کریم نے سورہ نازعات میں عشیۃ
کے مقابلہ میں ضحی کا لفظ استعمال کیا ہے:

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ
ضُحَاهَا (نازعات: ۴۶)

(جس روز وہ اس کو دیکھیں گے تو گویا
انھیں ایک دن کے پچھلے پہر یا اگلے پہر سے
زیادہ وقفہ نہیں گزرا)

اسی سورہ کی دوسری آیت میں رات
کو ڈھانپنے اور دن کو نکالنے کا ذکر ایک ساتھ
موجود ہے:

ءَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا رَفَعَ
سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا
(نازعات: ۲۷ — ۲۹)

کیا تمہارا بنانا زیادہ دشوار ہے یا آسمان
کا؟ اس کو اٹھایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پس
اس کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ اس کی رات ڈھانپ
دی اور اس کے دن کو بے نقاب کیا)

سورہ اعراف میں دن کے ایک مخصوص
حصہ کیلئے بطور ظرف زماں استعمال ہوا ہے:

أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى
وَهُمْ يَلْعَبُونَ (اعراف: ۹۸)

اور کیا بستیوں والے نچنت رہ سکے
اس بات سے کہ ان پر آ پڑے ہمارا عذاب دن
چڑھے اور وہ کھیل کود رہے ہوں؟)

اسی طرح سورہ طٰہٰ میں فرمایا:

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى (طٰہٰ: ۵۹)

(اس نے کہا تمہارے لئے وعدے کا دن میلہ والا دن ہے اور یہ کہ لوگ بوقت چاشت جمع کئے جائیں)

چنانچہ دکتورہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ ضحیٰ کا مطلب اس وقت سے ہے جب سورج اوپر اٹھنے لگتا ہے یعنی قسم ہے وقتِ چاشت کی اور رات کی جب وہ پرسکون ہو جاتی ہے۔ ضحیٰ چاشت کے وقت کو کہتے ہیں جب دن کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا اور انسان رات میں آرام کے بعد از سرِ نو تازہ دم ہو کر جدوجہد کے میدان میں اترتا ہے۔ امام راغب نے مفردات میں اور نیشاپوری نے غرائب القرآن میں یہی مفہوم لیا ہے۔ (۳۹)

۳۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی آیت کے متعلق قدیم و جدید تمام تاویلات نقل کرتی ہیں اور آخر میں اس رائے کو اختیار کرتی ہیں جو عربیت سے قریب تر، قرآن کی مجموعی روح سے ہم آہنگ اور نظمِ کلام اور اسلوبِ بیان سے میل کھانے والی ہو۔ سورہ ضحیٰ کی آیت مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کی تفسیر میں ان کا موقف یہ ہے کہ وحی کا سلسلہ رکنے کے جو اسباب تفسیر کی کتابوں میں بتائے گئے ہیں ان سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے جیسا کہ رازی اور نیشاپوری نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح، ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے بارے میں سوال کیا تھا تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں کل جواب دوں گا اور انشاء اللہ نہیں کہا جس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ یا یہ کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا ایک کتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود تھا اس لئے جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ جس گھر میں کتے یا تصویر ہوں ہم اس میں داخل نہیں ہوتے۔ یا یہ ان میں سے کسی کے ناخن تراشے ہوئے نہیں تھے اس لئے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ کتے کی یہ حکایت ابو حیان کی البحر المحیط میں بھی ہے۔ یہ سارے قصے من گھڑت اور فرضی ہیں جن کا نظمِ کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح مفسرین نے فترۃ الوحی کی جو مدت متعین کی ہے اس سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پندرہ، بارہ، پچیس اور چالیس دنوں کی تعیین (جو تفسیر رازی ۴۳۱ اور غرائب ۳۰/۱۸، ۲۹ میں موجود ہے) لاطائل ہے کیوں کہ قرآن اس سلسلے میں خاموش ہے اگر اس کی

ضرورت ہوتی کہ اس سے نفسی یقین میں اضافہ ہوتا یا زبان و بیان میں زور پیدا ہوتا تو قرآن ضرور بیان کرتا۔

آخر میں وہ لکھتی ہیں کہ یہاں قابلِ غور وہ صورتِ حال ہے جس میں یہ سورہ نازل ہوئی ہو یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار اور پریشانی کی کیفیت جسے قرآن نے کمر شکن بوجھ سے تعبیر کیا ہے (وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح: ۲-۳) اس قدر بے چینی اور وحی الٰہی کے شدید انتظار کی صورتِ حال میں یہ سورہ نازل ہوئی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کفار میں سے کسی کے اس طعنہ کے جواب میں کہ "اس شخص کو اس کے رب نے چھوڑ دیا" یہ آیت اتری ہو۔ اس لئے جزئیات یا قصہ کی تفصیلات سے ہمیں کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔

۴۔ آیات کی تفسیر و تشریح کے دوران انہوں نے بلاغت اور بیان کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں انہیں کوئی ادبی نکتہ ہاتھ آیا ہے اسے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے ادبی اعجاز کو پیش کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى کی تفسیر میں وہ یہ نکتہ اٹھاتی ہیں کہ وما قلٰی میں ضمیر مفعولی کیوں محذوف ہے، اور مختلف آراء و تاویلات نقل کرتی ہوئی لکھتی ہیں۔

زمخشری کا خیال ہے کہ محض لفظی اختصار کے پیشِ نظر مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اور دلیل کے طور پر قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں: وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ یہاں الذاکرات سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔ (۴۱)

طبری نے حذف کی جو علت بیان کی ہے وہ بھی تقریباً یہی ہے۔ ان کے نزدیک سامع کے فہم پر اعتماد کر کے مفعول کا ذکر نہیں کیا ہے کیونکہ ودّعک میں مفعول موجود ہے اور اس سے از خود معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (۴۲)

اسی طرح ابو حیان کا بھی یہی قول ہے کہ یہاں حذف اختصار کے پیشِ نظر ہے۔ (۴۳)

نظام الدین نیشاپوری نے ایک اور سبب کا اضافہ کیا ہے، وہ ہے فاصلہ یعنی ضحیٰ کی رعایت ہے اسی طرح بعد میں "فآویٰ، فهدیٰ اور فاغنیٰ" میں فواصل کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔

رازی نے بلاغتِ حذف کے تین اسباب گنائے ہیں:

١۔ ما ودعك میں مخاطب کا ذکر موجود ہے اس لئے اسی پر اکتفاء کیا گیا۔

٢۔ فواصل کی ہم آہنگی نے حذف کو واجب کر دیا۔

٣۔ مفعول کو حذف کر دینے سے اطلاق کا فائدہ حاصل ہو گیا یعنی ما قلاك و لا احداً من اصحابك و لا احد اً من احبك الی یوم القیامۃ یعنی اللہ نے نہ آپ سے قطع تعلق کیا ہے نہ آپ کے اصحاب سے نہ قیامت تک آپ کے محبین سے وہ نفرت کرے گا۔

ڈاکٹر بنت الشاطئی کہتی ہیں کہ اطلاق سے جو معانی نکلتے ہیں ان کی یہ آیت متحمل نہیں ہے کیونکہ سیاق کلام شاہد ہے کہ مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ فاصلہ کی رعایت میں حذف والی علت بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ لفظی اعتبار قرآن کی بلاغت کے منافی ہے۔ حذف کسی معنوی بلاغت کی وجہ سے ہوتا ہے جسے لفظی ادائیگی تقویت دیتی ہے نہ کہ لفظی ڈھانچہ ہی اصل قرار پا جائے اور معانی کی رعایت ملحوظ نہ رہ سکے۔ اگر صورت حال یہی ہوتی تو اسی سورہ ضحیٰ کے آخر میں فاصلہ کی رعایت کرتے ہوئے فلا تقهر اور فلا تنهر کی طرح فحدث کے بجائے فخبر ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے جبکہ اس لفظ سے پہلے کوئی فاصلہ ثاء پر ختم نہیں ہوا ہے بلکہ پوری سورہ میں اس کے علاوہ حرف ثاء موجود نہیں ہے۔

اس حذف کی اصل وجہ وہی ہے کہ پہلے چونکہ مخاطب موجود ہے اس لئے یہاں اسے حذف کر دیا اور اس میں جو غایت درجہ کی حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ کہ چونکہ لفظ "قلی" نفرت و کراہیت، ترک تعلق اور دوری، بعد اور وحشت سب کو محیط ہے جیسا کہ سورہ شعراء میں اس لفظ کا استعمال بتاتا ہے:

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُم مِّنَ الْقَالِينَ (شعراء: ١٦٨)

(انہوں نے کہا: "اے لوطؑ اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا" اس نے کہا "تمہارے کرتوتوں سے جو لوگ نفرت کرتے ہیں میں ان میں شامل ہوں")

اور یہاں یہ لفظ "قالین" بغض، شدید نفرت، کراہیت اور ترک تعلق کے معنیٰ میں بالکل واضح ہے۔ اس کے مقابلہ میں تودیع کا لفظ بالکل ہلکا ہے اس میں اس طرح کے معانی بالکل شامل نہیں ہیں بلکہ شاید اس لفظ تودیع میں بادل نخواستہ فراق اور امید واپسی

بھی شامل ہے اسی لئے قلی کا تقاضا یہ تھا کہ مفعول محذوف ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہاں تو جدائی اور وقتی فراق بعد واپسی اور ملاقات کی توقع کے ساتھ ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ (العیاذ باللہ) اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کرے یا ترک تعلق کرے یہی وہ نکتہ تھا جسے اس حذف میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ (٢٥)

اسی طرح سورہ الم نشرح میں فان مع العسر یسرا کی تکرار پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ تکرار تاکید اور زور پیدا کرنے کے لئے اور شک و شبہ کا مکمل ازالہ کرنے کے لئے ہے اور یہ تاکید مکی سورتوں میں زیادہ نظر آتی ہے کیونکہ آغاز رسالت کو ابھی زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا اور نفس یقین اور قلبی طمانیت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ پھر یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ عم پارہ کی چھوٹی سورتوں میں جہاں اعادہ و تکرار کی گنجائش نہیں تھی وہاں بھی تکرار کا یہ اسلوب پوری شان سے جلوہ گر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تاثیر، اقناع، استدلال اور تاکید میں اس اسلوب کو بڑا دخل ہے چنانچہ سورہ لیلۃ القدر، کافرون، فلق، تکاثر وغیرہ میں یہ اسلوب تکرار پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔ (٢٦)

اسی طرح سورہ تکاثر میں ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم پر بحث کرتی ہوئی لکھتی ہیں کہ تمام مفسرین نے نعیم سے مراد دنیوی نعمت لی ہے جس میں مال و اولاد، جاہ و حشم، اقتدار و منصب اور دنیوی مال و منال شامل ہے لیکن قرآن کے مواقع استعمال پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن میں نعمت کا لفظ ٣٤ مرتبہ استعمال ہوا ہے اور سب دنیوی نعمت کے معنیٰ میں ہے اسی طرح نعماء کا لفظ بھی (ہود: ١٠) دنیوی نعمت کیلئے خاص ہے اور نعم اور انعم (لقمان: ٢٠، نحل: ١١٢، ١٢١) کے جمع الفاظ بھی اسی معنیٰ میں مستعمل ہیں لیکن نعیم کا لفظ کہیں بھی دنیوی نعمت کے معنیٰ میں مستعمل نہیں ہے۔ تکاثر کو لیکر سولہ جگہوں پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اخروی نعمت کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اس لئے ہمیں بھی اخروی نعمت کے معنیٰ میں ہی استعمال کرنا ہوگا۔ اور اس میں بلاغت یہ ہے کہ آخرت میں دنیوی نعمت کے بارے میں سوال نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس بات سے بہت فروتر ہے کہ اس پر سوال ہو

سوال اس اخروی نعمت پر ہوگا جس سے
غافل ہو کر انسان دنیوی نعمتوں کو حقیقی نعمت
سمجھ بیٹھا ہے، اور اپنے فرائض منصبی سے
غافل ہے۔ (۲۸)

۵۔ اس طریقہ تفسیر کی ایک اہم خوبی یہ
ہے کہ اس میں ہر آیت کا سادہ اور عام فہم
انداز میں مطلب بتانے کی کوشش کی گئی
ہے لیکن یہ تفسیر ربط کلام اور نظم سیاق و سباق
سے کٹ کر نہیں کی گئی ہے بلکہ ان چیزوں کو
بدرجۂ اتم ہر ہر قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے اور
اس کیلئے کوئی ایک مثال ناکافی ہے تفصیل
کے طالبین کو خود اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے

تفسیر کی یہی خوبیاں تھیں اور یہی وہ
صحت مند اصول تھے جن کی وجہ سے المجمع العلمی
العربی دمشق کے رکن ڈاکٹر محمد مبارک نے
اسے تفسیر کی ادبی کاوشوں میں ایک سنگ
میل قرار دیا اور اپنی کتاب "من منہل الادب
الخالد" میں بطور خاص اس کا تعارف کرایا۔

تعلیقات حواشی

(۲۸) ایضاً ص: ۔
(۲۹) ایضاً ص: ۱۰
(۳۰) ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن جلد اول
طبع اول ص: ۴۲
(۳۱) مفاتیح الغیب ۳/۵۴
(۳۲) مقدمہ تفسیر نظام القرآن ص
(۳۳) سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن جلد
اول ص ۳۶
(۳۴) الفوز الکبیر اردو ترجمہ رشید احمد انصاری
مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۳ء ص: ۵
(۳۵) الفوز الکبیر اردو ترجمہ ص: ۴۰
(۳۶) ایضاً ص: ۷۷
(۳۷) مائدہ: ۹۲، نساء: ۴۲، توبہ: ۴۳، ۵۷
۹۲، ۹۶، ۴، ۱۰۷، مجادلہ: ۴، ۸۱، ق ۱۰
(۳۸) تفسیر بیانی ص: ۴۸، ۴۹
(۳۹) ایضاً ص: ۲۰، ۲۱
(۴۰) ایضاً ص: ۲۵، ۲۶
(۴۱) الکشاف ۴/۲۱۹
(۴۲) تفسیر طبری ۳۰/۱۴۷
(۴۳) دیکھئے نظام الدین نیشاپوری غرائب
القرآن ۳۰/۱۰۸
(۴۴) تفسیر رازی ۸/۲۲۰
(۴۵) تفسیر بیانی ص ۲۴، ۲۵
(۴۶) ایضاً ص ۵/۵۸
(۴۷) طور: ۱۷، توبہ: ۴۹، واقعہ: ۸۹، ۱۲
معارج: ۳۸، انفطار: ۱۳، مطففین: ۲۲
مائدہ: ۶۵، یونس: ۹، حج: ۵۶، صافات
۴۳، لقمان: ۸، شعراء: ۸۵، ق: ۳۴
(۴۸) تفسیر بیانی ص: ۱۵-۱۹۸ (۴۹) ڈاکٹر محمد مبارک، من منہل الادب الخالد ص ۱۱۷

غزل

ڈاکٹر شرقی سہانی

رسن و طوق سے ماتھے پہ تھی جن کے نمی
مجھ کو ایسوں سے رہا ہے شرف ہم قلمی

کتنی خاموشی سے کرنوں نے اڑائی ہے نمی
آگئی شام کو سبزے کی تراوت میں کمی

عشق کرنا ہے تو کچھ فقر کے آداب بھی سیکھ
رہگذر یہ تو نہ ملے ہوگی بایں پر شکمی

راس آئی نہ کوئی سمت سفر اف رے شباب
آنکھ اس وقت کھلی پشت میں جب آئی خمی

تا کجا ایک ہی لے ساز لقا اب تو اٹھاؤ
ہم تو اکتا گئے اے نغمہ گرانِ عدمی

سن کے ہم زمزمۂ زاہد[1] و کلبانگ حفیظ[2]
اے غزل کیسے کہیں تجھ کو نگار عجمی

بت کوئی جلوہ فگن ہو دل شرقی پہ خدا
چین لینے نہیں دیتی ہے ہوائے صنمی

---

[1] ابو المجاہد زاہد [2] حفیظ میرٹھی

تحریر: الدکتور عبدالرحمن رافت الباشا
ترجمانی: ابو جاوید استاذ جامعہ

حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ

جن کی تصدیق کیلئے وحی آسمانی کا نزول ہوا!

ننھے عمیر نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ انکے باپ سعد کا انتقال ہوگیا اور اسکی پیشانی پر یتیمی کا داغ لگ گیا۔ باپ نے مرتے وقت نہ مال و دولت چھوڑی تھی نہ کوئی سرپرست جسکی وجہ سے عمیر بے یار و مددگار اور بے سہارا رہ گیا۔ لیکن بیوہ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی اسکی ماں نے قبیلہ بنی اوس کے ایک مالدار شخص جلاس ابن سوید سے نکاح کر لیا جس نے عمیر کو اپنی سرپرستی میں لیکر اسکی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جلاس نے عمیر کو اتنا پیار دیا، اس سے ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا اور اسکے ساتھ اسطرح حسن و سلوک سے پیش آیا کہ اسے کبھی اپنی یتیمی کا احساس تک نہ ہوا۔

عمیر کو نشوونما پاتے اور پروان چڑھتے دیکھکر جلاس بہت خوش ہوتا کیونکہ عمیر میں شرافت کے ساتھ ساتھ انکے تمام اعمال و افعال اور اسکی ساری حرکات و سکنات میں ذہانت و فطانت اور صداقت و دیانت کے آثار واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔

عمیر ابن سعد کی عمر ابھی دس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی کہ وہ اسلام کے ٹھنڈے اور نرم سائے میں آگیا۔ ایمان انکے سادہ و پاک اور معصوم دل میں اچھی طرح جاگزیں ہوگیا اور اسلام کا بیج انکے زرخیز وجود کو موافق اور سازگار پاکر خوب برگ و بار لایا۔ عمیر ابن سعد اپنی کم عمری کے باوجود ہر نماز رسول کریم کے پیچھے باجماعت ادا کرتا۔ اور جب اسکی ماں کبھی اسے اپنے اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مسجد جاتے یا مسجد واپس آتے دیکھتی تو اسکا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔ یہ عمیر ابن سعد کی زندگی کے شب و روز اسی طرح عیش و آرام اور مسرت و شادمانی کیساتھ گذر رہے تھے کہ خداوند تعالیٰ نے اسے ایک سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ مشیت ایزدی نے اسکو ایک ایسے بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ شاید ہی اس عمر کا کوئی بچہ اس سے دوچار ہوا ہو۔

سنہ ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کیلئے تبوک جانے کا اعلان فرمایا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے لیے تیاریاں مکمل کرلیں۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوہ کا ارادہ کرتے تو اسے صاف صاف بیان نہیں فرماتے تھے۔ اور صحابہ کرامؓ متعین طور پر یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کدھر اور کس سے جنگ ہوگی۔ مگر خلاف معمول غزوہ تبوک کے موقع پر آپؐ نے صراحت کے ساتھ یہ بات بتادی تھی کہ رومیوں سے جنگ کے لئے تبوک چلنا ہے کیونکہ جنگ کی یہ مہم بعد مسافت خصوصیت سفر اور دشمن کی طاقت و قوت کے اعتبار سے بہت اہم تھی تاکہ مسلمان اسکی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسب حال خاطر خواہ اور اطمینان بخش تیاری کرلیں۔ اس وقت موسم گرما شروع ہو چکا تھا، دھوپ میں کافی شدت آگئی تھی، باغوں میں پھل پک کر تیار تھے، سائے گھنے اور ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ اور اس وقت کسی جنگی مہم پر جانا اور ایسے دور دراز کا سفر کرنا آسان نہ تھا۔ مگر ان سب کے باوجود اسلام کے شیدائیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کا بہت خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ البتہ منافقین کی ایک ٹولی اس مہم کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتے جن سے مخلص مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ حوصلے ٹوٹ جائیں اور انکے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں۔ وہ حضورؐ پر آوازیں کستے اور اپنی نجی مجلسوں میں بے محابا ایسی باتیں اپنی زبانوں پر لاتے جو انکے کفر کی واضح اور روشن دلیل ہوتیں۔

لشکر کی روانگی سے چند روز قبل کی بات ہے۔ ایک دن عمیر بن سعد نماز پڑھکر مسجد سے واپس آیا۔ وہاں اس نے مسلمانوں کے ایثار و قربانی اور جذبہ انفاق فی سبیل اللہ کے جو حسین و دلکش مناظر دیکھے اور ایمان و یقین اور عزم و حوصلے سے بھرپور جو باتیں سنیں، ان سے اسکا پیمانہ دل جوش و مسرت سے لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے مہاجرین و انصار کی عورتوں کو دیکھا کہ وہ حضورؐ کے سامنے آتیں اور اپنے زیورات اتار کر خدمت اقدس میں پیش کر دیتیں تاکہ آپ مجاہدین کے لیے سامان جہاد فراہم کرسکیں۔ اس نے اپنے سر کی آنکھوں سے حضرت عثمان بن عفان کو دیکھا۔ وہ چمڑے کی ایک تھیلی جس میں ایک ہزار دینار تھے ــــ لائے اور آپکے بارگاہ نبوت میں پیش کر دیا۔ اسکی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف اپنے کندھے پر دو سو اوقیہ سونا لادے چلے آ رہے ہیں اور نبی کریمؐ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں، اس نے تو یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص اپنا بستر فروخت کے لئے پیش کر رہا ہے تاکہ اس کی

قیمت سے وہ اپنے لئے ایک تلوار خرید کر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو سکے۔

ایک طرف یہ دل کش اور حیرت انگیز مناظر تھے جو عمیر کے پردۂ ذہن پر مرتسم ہو رہے تھے اور دوسری طرف وہ اس افسوس ناک اور حیرت انگیز صورت حال کا سامنا کر رہا تھا کہ جلاس اپنی خوش حالی اور فراخی کے باوجود جنگ کی تیاریوں سے بے خبر غافل ہے اور اسکے یہاں اس معاملے میں کوئی حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ جلاس کو اسکی طرف توجہ دلائے گا اور اسکی حمیت و مروت کو ابھارے گا۔ اس نے جلاس کے سامنے وہ ساری حوصلہ افزا اور ایمان افروز باتیں بیان کرنی شروع کیں جنھیں وہ سن کر آیا تھا اور ان تمام مناظر کی تصویر کشی کرنے لگا جنھیں اس کی آنکھیں دیکھ کر آئی تھیں۔

خاص کر اس نے ان مفلس مسلمانوں کے شوق جہاد کی روداد سنائی جو حضورؐ کے پاس آئے اور بڑے لجاجت کے ساتھ یہ درخواست بارگاہ رسالت میں پیش کی کہ انھیں بھی مجاہدین کی صف میں شامل کر لیا جائے لیکن نبی کریمؐ نے ان کی درخواست اس وجہ سے رد کر دی کہ آپؐ کے پاس ان کے لیے سواریوں کا انتظام نہ تھا اور وہ اپنی بے بسی و محرومی پر آنسو بہاتے ہوئے واپس چلے گئے کہ ان کو وہ زاد و سامان میسر نہیں جس کو لے کر وہ جہاد میں شریک ہوں۔ اور اپنی آرزو پوری کریں۔

لیکن عمیر سے یہ باتیں سنتے ہی جلاس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے اس کمسن مومن کے ہوش اڑا دیئے۔ اس نے کہا۔

"اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (نبی کریمؐ) پیش کر رہا ہے تو ہم لوگ گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔" جلاس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر عمیر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جلاس جیسے تجربہ کار جہاندیدہ اور صاحب فہم و شعور شخص کے منہ سے ایسی بات نکلے گی جو اسے یکایک دائرہ ایمان سے نکال حلقۂ کفر میں داخل کر دے گی۔

عمیر تو نو عمر اور کمسن تھا۔ اس صورت حال سے سخت سراسیمہ و پریشان تھا۔ وہ اس فکر میں سرگشتہ و حیران تھا کہ اس وقت وہ اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کرے۔ اس نے سوچا کہ جلاس کی طرف سے خاموشی اختیار کر کے اسکی پردہ پوشی کرنا خدا اور رسول سے خیانت کے مترادف اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے ہم معنی ہے۔ اور جو کچھ سنا ہے اسے ظاہر کر دینے میں ایک ایسے شخص کی احسان فراموشی ہے جس نے اسے باپ کا پیار دیا اور یتیمی و تنگ دستی کی حالت میں پناہ دی۔ بہرحال عمیر اس دوراہے پر تھوڑی دیر کے لئے حیران و ششدر کھڑا رہا۔ مگر جلد ہی وہ ایک قطعی اور آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ وہ جلاس کی طرف توجہ مبذول کرتے

ہوئے بولا۔

"خدا کی قسم اے جلاس! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد روئے زمین پر کوئی دوسرا شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ مگر آپ نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر میں اس کا ذکر کروں تو آپ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔ اور اگر خاموشی اختیار کروں۔ تو جرم خیانت کا مجرم ٹھہروں اور اپنے دین و ایمان کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کروں۔ میں اس بات کا عزم کر چکا ہوں کہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی کہی ہوئی بات سے نبی کریمؐ کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ اپنے بچاؤ کا جو طریقہ چاہیں سوچ لیں۔"

اسکے بعد عمیر بن سعد نے مسجد پہنچ کر وہ سب کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گذار کر دیا جو اس نے جلاس سے سنا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا اور ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ جلاس کو بلا لائیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جلاس بارگاہ نبوت میں حاضر ہو گیا اور سلام کر کے آپکے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔

"جلاس! یہ کیسی بات ہے جو عمیر نے تم سے سنی ہے؟" پھر آپ نے وہ بات اسے بتائی۔

"اے اللہ کے رسول! اس نے سراسر کذب بیانی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے میں نے یہ بات نہیں کہی ہے۔" جلاس نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔

یہ سن کر صحابہ کرام کی نظریں باری باری جلاس اور عمیر کے چہروں کا جائزہ لینے لگیں تاکہ وہ ان کے چہروں سے انکے دلوں میں پوشیدہ باتوں کا اندازہ لگا سکیں ــــ اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ ایک شخص جسکا دل نفاق کا مریض تھا۔ بولا۔

"یہ لڑکا بڑا نافرمان اور احسان فراموش ہے۔ اپنے محسن کے ساتھ بدی کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

دوسرے نے کہا "نہیں یہ ایک ہونہار اور سعادت مند لڑکا ہے۔ اطاعت الٰہی کے زیر سایہ اسکی نشو و نما ہوئی ہے۔ اسکے چہرے کے آثار اسکی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر کی طرف رخ کیا تو دیکھا کہ اسکا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو کی دھاریں بہہ کر اسکے رخسار اور سینے کو تر کر رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے۔

"اے اللہ! اپنے نبیؐ پر میرے بیان کی تصدیق نازل فرما دے۔ اے اللہ! ......"

جلاس نے اپنے دفاع میں بولتے ہوئے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست اور حق ہے۔ آپ چاہیں تو ہم

دونوں سے حلف لے لیں۔ اور میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے وہ بات نہیں کہی جو عمیر نے آپ سے بیان کی ہے۔"

جیسے ہی وہ قسم سے فارغ ہوا اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ کر عمیر کی طرف منتقل ہوئیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے آثار طاری ہو گئے۔ صحابہ کرام سمجھ گئے کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و صامت اور پرسکون ہو کر بیٹھ گئے۔ اور انکی نگاہیں حضور پر جم گئیں۔ اس وقت جلاس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلتے جا رہے ہیں اور عمیر کے اوپر اطمینان اور انتظار کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں آپ کے اوپر سے نزول وحی کے آثار زائل ہو گئے اور آپ نے فرمان الٰہی کی تلاوت فرمائی۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

مترجمہ:۔ یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی ہے حالانکہ انھوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے۔ ان کا یہ سارا غصہ اسی بات پر ہے نا کہ اللہ اور اسکے رسول نے اپنے فضل سے انکو غنی کر دیا ہے۔ اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں تو انہیں کے لیے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ انکو دردناک عذاب دیگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آخرت میں انکا کوئی نہیں جو انکا حمایتی اور مددگار ہو۔"
(توبہ ۔ ۷۴)

اسکو سنتے ہی جلاس خوف سے کانپنے لگا اور اسکی زبان اسکے تالو سے چپک گئی پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی مشکل سے بولا۔

"بَلْ أَتُوبُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، بَلْ أَتُوبُ ...
.... عمیر نے سچ کہا تھا اور میں جھوٹا تھا، یا رسول اللہ میری جان آپ پر فدا ہو، آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ میری توبہ قبول فرمائے۔

آپ نے عمیر بن سعد کی طرف توجہ فرمائی تو دیکھا کہ مسرت کے آنسو اسکے [illegible] منور چہرے کو تر کر رہے ہیں۔ آپ نے دست مبارک سے بڑھا کر اسکا کان پکڑا اور فرمایا:

"بچے! تیرے کانوں نے جو کچھ سنا صحیح سنا: تیرے رب نے تیری بات کی تصدیق کر دی۔"

اسکے بعد جلاس مکمل طور پر دائرہ اسلام میں واپس آگئے اور زندگی بھر اسپر ثابت قدم رہے۔ اور صحابہؓ نے بھی انکے بہترین طرز عمل کو دیکھا کیونکہ انھوں نے عمیر بن سعد کے ساتھ سابقہ برتاؤ میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ پہلے سے زیادہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جب بھی انکے سامنے عمیر کا ذکر چھڑتا تو کہتے کہ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر عطا فرمائے اسنے مجھے کفر سے نجات دلائی اور میری گردن کو جہنم کے عذاب سے چھڑا لیا۔

یہ نو عمر صحابی، حضرت عمیر بن سعدؓ کی بچپن کی تصویر ہے جو نہایت حسین اور بہت حد دلنواز ہے، مگر انکی جوانی کی تصویر اس سے کہیں خوشنما اور دل افروز [illegible] ہے۔

حمص کے باشندے اپنے گورنروں کو پریشان اور انکے خلاف شکایت کرنے میں مشہور تھے جب انکے یہاں کوئی گورنر آتا، اسکے اندر کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈ نکالتے۔ اسکی شکایت دربار خلافت میں پہنچاتے۔ اور خلیفہ سے مطالبہ کرتے کہ اسکی جگہ پر اس سے بہتر حاکم مقرر کیا جائے۔ یہ دیکھ کر امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ نے طے کر لیا تھا کہ انکے اوپر کسی ایسے شخص کو والی بناؤں گا، کہ جسکی سیرت و کردار پر انھیں کسی طرح سے اعتراض اور نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ انھوں نے ایک ایک کرکے اپنے تمام قابل اعتماد افسروں پر نظر ڈالی۔ آخرکار انکی نگاہ انتخاب حضرت عمیر بن سعدؓ پر جاکر ٹک گئی۔ انکی نظر میں اسکے لیے ان سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔

اسکے باوجود کہ انھوں نے شام کے علاقہ الجزیرہ میں غازیان اسلام کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بہت سے شہروں اور قلعوں پر فتح کے پرچم لہرا دیئے تھے۔ اور متعدد قبائل کو مطیع فرمان کر لیا تھا۔ امیرالمومنین نے شام کے محاذ سے واپس بلاکر حمص کی گورنری کا عہدہ انکے سپرد کیا اور وہاں جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمیر بن سعدؓ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے بالمقابل کوئی چیز قابل ترجیح نہ تھی مگر انھوں نے امیرالمومنین کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب وہ حمص پہونچے تو سب سے پہلے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے جمع کیا۔ نماز ختم ہونے پر تقریر کے لیے کھڑے ہوئے، اور اللہ کی حمد و ثنا اور رسول پر درود و سلام کے بعد فرمایا۔

لوگو! اسلام ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط دروازہ ہے۔ اسلام کا قلعہ عدل و انصاف اور اسکا دروازہ حق و صداقت ہے۔ اگر قلعہ ٹوٹ جائے اور دروازہ اکھڑ جائے گا تو اس دین کی عمارت پامال ہو جائے گی۔ اسلام اسی وقت تک مستحکم و

مضبوط رہے گا اسلام محفوظ رہے گا۔ اور اس قدر کی مضبوطی کوڑے سے پیٹنے اور تلوار سے قتل کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ اسکی مضبوطی اور استحکام کا راز حق کو اختیار کرنے اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے میں مضمر ہے۔"

اسکے بعد وہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں منہمک ہو گئے جسکا اعلان انھوں نے اپنی اس مختصر سی تقریر میں کیا تھا۔

حضرت عمیرؓ بن سعد نے حمص میں مکمل ایک سال گذارا مگر اس مدت میں نہ تو انھوں نے دربار خلافت کو کوئی خط لکھا نہ مسلمانوں کے بیت المال کیلئے خراج وغیرہ کی کوئی رقم بھیجی تو خلیفہ کے دل میں انکے خلاف شکوک و شبہات نے سر اٹھانا شروع کیا کیونکہ وہ اپنے گورنروں کے متعلق امارت کے فتنے سے خائف رہتے اور ہوشیار رہتے تھے۔ انکے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معصوم نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا کہ عمیرؓ بن سعد کو لکھو کہ امیر المومنین کا خط پاتے ہی حمص کو چھوڑ دو، دربار خلافت کے لئے روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ خراج کی وہ پوری رقم لے کر آؤ جو تم نے ابتک جمع کی ہے۔"

خط پڑھ کر انھوں نے زاد راہ کی تھیلی اٹھائی، کندھے پر پیالہ اور پانی کا برتن رکھا، ہاتھ میں نیزہ تھاما اور حمص کو اپنے پیچھے چھوڑ کر پیدل ہی مدینہ پہنچے تو بھوک اور تھکن کی وجہ سے انکا رنگ بدل گیا تھا، جسم نحیف و لاغر ہو گیا تھا، سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے اور صعوبت سفر کے آثار انکے اوپر پورے طور سے نمایاں تھے۔

حضرت عمرؓ نے انھیں اس حال میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے اور ان سے پوچھا۔

"عمیر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"امیر المومنین! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ خدا کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں میں اپنے ساتھ اپنی پوری دنیا اٹھا لایا ہوں۔" عمیرؓ نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ کیا ہے؟" انھوں نے سمجھا کہ بیت المال کیلئے خراج کی رقم لائے ہیں۔ "میرے ساتھ میری تھیلی ہے جس میں زاد راہ رکھتا ہوں، میرا پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں، جس سے اپنا سر اور اپنے کپڑے دھلتا ہوں، میرے ساتھ میرا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں۔" ایک لمحہ توقف کے بعد پھر بولے۔

"امیر المومنین! میرے اس سامان کے علاوہ باقی دنیا میرے لئے بے ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی احتیاج نہیں۔"

"کیا تم پیدل ہی آئے ہو؟"

"ہاں اے امیر المومنین۔"

"بیت المال سے سواری کے لئے تمہیں کوئی گھوڑا نہیں ملا؟"

"انھوں نے دیا نہ میں نے ان سے اسکا مطالبہ کیا۔"

"تم بیت المال کے لئے جو رقم لائے ہو، وہ کہاں ہے؟"

"میں بیت المال کے لئے کچھ نہیں لایا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"حمص پہنچا تو میں نے وہاں کے صلحاء کو جمع کر کے خراج کی وصولی اور اسکی فراہمی کی ذمہ داری انکو سونپ دی تھی، وہ جو کچھ بھی وصول کر کے لاتے تھے انکے مشورے سے وہ پوری رقم مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔" حضرت عمیرؓ بن سعد نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے کاتب سے فرمایا۔

"عمیرؓ کے لئے حمص کی گورنری کا پروانہ تجدید تحریر کر دو۔"

"نہیں امیر المومنین! میں اب یہ ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا، نہ آپ کے لئے نہ آپ کے بعد کسی دوسرے کے لئے۔" حضرت عمیرؓ نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ حضرت عمرؓ سے اجازت لے کر مضافات مدینہ کی ایک بستی میں چلے گئے جہاں انکے اہل و عیال مقیم تھے۔ عمیرؓ بن سعد کو اپنی بستی میں آئے ابھی زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ حضرت عمرؓ نے ان کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے ایک قابل اعتماد شخص، حارث کو بلا کر کہا کہ "عمیر کے یہاں جاؤ اور وہاں بحیثیت مہمان قیام کرو۔ اگر تمہیں ان کے یہاں خوش حالی اور کشادگی کے آثار نظر آئیں تو تو فوراً واپس آ کر مجھے آگاہ کرنا۔ اور اگر افلاس و تنگدستی کے حالات دیکھو تو یہ سو دینار ان کے حوالے کر دینا۔" انھوں نے دیناروں کی تھیلی انکو تھماتے ہوئے کہا۔ حارثؓ عمیرؓ کی بستی میں آئے، اور پتہ پوچھتے ہوئے انکے گھر پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو انکو سلام کیا۔ حضرت عمیرؓ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مدینہ سے۔"

"مدینے کے مسلمان کیسے ہیں؟"

"بخیر و عافیت۔"

"امیر المومنین کیسے ہیں؟"

"وہ بھی بخیریت ہیں۔"

"کیا وہ حدود کا نفاذ نہیں کر رہے ہیں؟"

"کیوں نہیں، ابھی انھوں نے اپنے ایک لڑکے پر حد زنا کا نفاذ کیا ہے جسکے نتیجے میں اسکی موت واقع ہو گئی۔"

"اے اللہ عمرؓ کی مدد فرما، وہ تجھ سے انتہا محبت کرتے ہیں۔" انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

حارثؓ عمیرؓ بن سعد کے یہاں مہمان کی

حیثیت سے تین رات مقیم رہے۔ وہ ہر رات انکو جو کی ایک روٹی پیش کرتے۔ تیسرے دن انکے قبیلے کے ایک شخص نے حارثؓ سے کہا کہ تم نے عمیرؓ اور انکے گھر والوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ انکے پاس ایک ہی روٹی ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود بھوک اور فاقہ کے ہاتھوں پریشان ہونے کے باوجود تم کو اپنے آپ پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو تم میرے یہاں منتقل ہو جاؤ۔

اس کے بعد حارثؓ نے دیناروں کی تھیلی نکالی اور عمیرؓ کے سامنے رکھ دی۔ عمیرؓ نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اسے امیر المومنین نے آپ کے لئے بھیجا ہے"

"اسکو واپس لے جاؤ اور انکی خدمت میں میرا سلام پیش کرنے کے بعد کہنا کہ عمیرؓ کو اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ سن کر انکی اہلیہ بول پڑیں ——— وہ اپنے شوہر اور مہمان کی گفتگو دروازے کی اوٹ سے سن رہی تھیں ——— "عمیرؓ! اسے لے لیجئے، آپ کو ضرورت ہو تو خرچ کیجئے ورنہ مستحقین میں تقسیم کر دیجئے۔ یہاں ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کمی نہیں ہے۔"

حارثؓ دیناروں کی تھیلی عمیرؓ کے سامنے چھوڑ کر واپسی کے لئے مڑ گئے۔ عمیرؓ نے دیناروں کو لیا اور انھیں بہت سی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں رکھ کر راتوں رات ضرورت مندوں خصوصاً شہداء کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ ادھر حارثؓ مدینہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

"حارثؓ! تم نے کیا دیکھا؟"

"امیر المومنین! عمیرؓ اور انکے اہل و عیال بڑے سخت حالات سے دوچار ہیں۔"

"تم نے دینار ان کو دے دیئے تھے؟"

"ہاں اے امیر المومنین!"

"انھوں نے کیا کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ان میں سے ایک دینار بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے۔"

تب حضرت عمرؓ نے حضرت عمیرؓ بن سعد کو لکھا۔

"میرا یہ خط تم کو ملے تو اسے اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے مدینے کے لیئے روانہ ہو جاؤ۔"

حضرت عمیرؓ نے مدینہ کا رخ کیا اور دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے انکا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے۔

"عمیر! تم نے ان دیناروں کا کیا کیا۔؟"

"امیر المومنین! جب وہ دینار آپ مجھے دے چکے تھے تو اب آپکو ان سے کیا غرض ہے؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے انکو کہاں خرچ کیا۔"

"میں نے انھیں جمع کر دیا تھا تاکہ وہ اس روز میرے کام آئیں جس روز مال اور اولاد کوئی چیز کام نہ آسکے گی۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"عمیرؓ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو تنگدستی کے باوجود ایثار پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔"

پھر آپؓ نے انھیں ایک وسق غلہ اور دو کپڑے دینے کا حکم دیا۔ حضرت عمیرؓ نے کہا۔

"امیر المومنین! مجھے غلے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو صاع جو گھر چھوڑ آیا ہوں۔ جب تک ہم انہیں کھائیں گے، خدائے تعالیٰ ہمارے لئے رزق کا بندوبست کر دیگا۔ البتہ کپڑے میں بیوی کے لئے رکھ لیتا ہوں۔ انکے کپڑے بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔"

اس ملاقات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ حضرت عمیرؓ بن سعد کو اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا وقت آپہنچا، ان سے ملنے کا شوق انھیں تب و تاب مضطر اور بیقرار رکھتا تھا۔ وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو اس شان سے کہ انکے کندھے پر دنیا کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ انکے اس سفر میں انکے ساتھ اگر کوئی چیز تھی تو وہ انکا نور ایمان و ہدایت اور انکا زہد و تقویٰ تھا۔

حضرت عمرؓ کو جب انکے سانحۂ ارتحال کی اطلاع پہونچی تو انکا دل حزن و ملال سے بھر گیا اور چہرے پر رنج و الم کے آثار نمایاں ہو گئے جو انکے اندرونی کرب کا پتہ دے رہے تھے۔ انھوں نے حضرت عمیرؓ بن سعد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

وَدِدْتُ أَنَّ لِي رِجَالاً — کاش میرے پاس عمیرؓ بن سعد
مِثْلَ عُمَيْرِ بْنِ سَعْدٍ — جیسے کچھ اور لوگ ہوتے جن سے
أَسْتَعِينُ بِهِمْ فِي — میں مسلمانوں کے مسائل میں
أَعْمَالِ الْمُسْلِمِينَ۔ — مدد لیتا

اللہ تعالیٰ حضرت عمیرؓ بن سعد سے راضی ہو۔ وہ اپنے عصر کے یگانہ و بے مثال فرد تھے۔

ادب اور وابستگی

ڈاکٹر عبد الباری کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ
جس میں ادب اور نظریہ، ادب اور ثقافت، ادب اور معاشرہ،
جدید ادب کی فکری اساس جیسے مسائل پر گفتگو بھی ہے
اور اسلامی ادب کے امکانات کا جائزہ بھی
فراق، مجنوں گورکھپوری، شکیل جونپوری، [illegible]
وغیرہ کے فکر و فن پر تنقیدی نگاہ بھی ڈالی گئی ہے
خوشنما ٹائٹل مجلد مع گرد پوش قیمت 20/-
دانش بکڈپو، ٹانڈہ، ضلع فیض آباد، یوپی
224190

غزل

شوق طابری

جب تحفظ کا اعلان ہوجائے گا
شہر کا شہر ویران ہوجائے گا

اک قصیدہ ہی کافی ہے دربار میں
بام شہرت کا عنوان ہوجائے گا

اب تو دریا کا رُخ موڑنا چاہیے
ورنہ سیلاب طوفان ہوجائے گا

چوکیاں ہر قدم پر نہ بنوائیے
راستہ ورنہ سنسان ہوجائے گا

اور کس کو سناؤ گے رودادِ غم
وہ تو سنتے ہی انجان ہوجائے گا

ہم سے رندوں کی صحبت بڑی چیز ہے
اک فرشتہ بھی انسان ہوجائے گا

ہر نئے زخم کا خیر مقدم کرو
جادۂ شوق آسان ہوجائے گا

جرم پہلے شفق کا ثابت دیجئے
پھر یہ کافر مسلمان ہوجائے گا

غزل

اختر آعظمی جلالپوری

اب مجھ گفتگو ہوں کسی رازداں کے ساتھ
اک مہربان مل گیا اک مہرباں کے ساتھ

چلنے لگتے ہیں وہ کس بے کسی سے اب
کہیے جب اُن سے آؤ چلیں کارواں کیساتھ

وعدے زبانِ دُوم کے پھر ہو رہے ہیں آج
کرتے رہے مذاق جو اُردو زبان کیساتھ

دیکھیں یہ گل کھلاتی ہے کیا کیا نشاط میں
فصلِ بہار آئی ہے دورِ خزاں کے ساتھ

اختر بہار آکے غضب اور ڈھا گئی
بجلی بھی کوندتی ہے مرے آشیاں کے ساتھ

عبدالغفار سوز

ترقی

"ایک مزاحیہ تحریر جس سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے اور جس کا ہر لفظ دل میں تیرو نشتر بن کر اُترتا چلا جاتا ہے اور جیسے جیسے حقائق صفحۂ قرطاس پر نقش بنتے جاتے ہیں دل دردسے بے تاب ہو جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے قلم کار عبدالغفار سوز کے قلم سے۔"

انسانی معاشرہ ہر گذرنے والے دن کے ساتھ تغیر کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ انسانی ذہن کو قرار میسر نہیں ہے حالانکہ وہ اشرف المخلوقات ہے اسلئے وہ خوب سے خوب تر کی طرف اور اکثر اپنی ذہنی قلا بازیوں کی وجہ سے بد سے بدتر کی طرف ہونے پر مجبور ہے انسان نے اپنی ذہنی قلا بازی کو ترقی کا نام دے رکھا ہے۔ حالانکہ اسکی تخلیق احسن تقویم پر ہوئی تھی مگر اسکی حماقت اسے اسفل السافلین سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

پھر ایسی ترقی کی عملداری سے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی محفوظ نہیں۔ یہ انسان کی ساری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اکثر انسانی لباس کی تراش خراش بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے زنانہ بلوز کا گلا کبھی بند کبھی کھلا کبھی اونچا کبھی نیچا اور آستیں ہوتا رہتا ہے باہیں کبھی چھوٹی کبھی بڑی ہوتی ہوتی [illegible] اپنی گھٹتی کی شکل اختیار کرتی ہیں تو کبھی سکڑتی سکڑتی بالکل غائب ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح مردوں کی پتلونوں کبھی ڈھیلی کبھی تنگ ہوتی تھی۔ مگر [illegible] کا دور تو انسانی ترقی و آزادی کے دلدادہ مرد ہیں نے عورتوں

کو نہ صرف آزادی دلائی بلکہ عورتوں کو مردوں کے برابر لا کھڑا کرنے کی دھن میں عورتوں کو لباس کے نام پر بے لباس بلکہ برہنہ کیا تو تھا مگر اب کم از کم لباس کے معاملہ میں عورت اور مرد کی تخصیص ہی مٹا دی عورت کو پتلون اور ٹی شرٹ پہنا کر۔ پھر بھی شکر ہے کہ عورتوں نے ساڑیوں پر اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھا ہے مگر ساڑیوں کے پہننے کے انداز و اسٹائل میں تبدیلی آگئی ہے پہلے ساڑی تن ڈھانپنے کے لئے پہنی جاتی تھی۔ مگر اب ...... کہنے کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں۔

وقت کے ساتھ معاشرہ میں انسانی قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے جس بات یا عمل کو ناپسندیدہ خیال کیا جاتا تھا آج وہی بات یا عمل دقیانوسیت اور قدامت پرستی کی علامت سمجھی جاتی ہے آج ساری دنیا ایک عظیم نفاق کا شکار ہو چکی ہے۔ سگریٹ نوشی صحت کے لئے مضر ہے یہ عبارت سگریٹ کی ہر ایک پاکٹ پر لازمی طور سے چھپی یا چھپی رہتی ہے سگریٹ نوشی کی ترغیب دلانے والے جہازی سائز کے پوسٹروں میں بھی اس عبارت کا لکھا جانا لازمی ہے۔ اخباروں اور رسالوں کے بیشتر اشتہارات جو مختلف برانڈز اور قسموں کے سگریٹوں کی مانگ میں اضافہ کرنے کے لئے دئے جاتے ہیں اُن میں بھی یہ انتباہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ گویا آج یہ عبارت اپنے معنی کھو چکی ہے اور حکومتیں مطمئن ہیں کہ انھوں نے بقول شاعر "تیغ دیدہ ہم آپ کو سمجھانے دیتے ہیں" چونکہ حکومت رعایا کی اور رعایا کے لئے ہے۔ اسلئے حکومت شراب نوشی کے نقصانات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے صاف ستھرے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے بروشر، پوسٹرز، بورڈز، بکلیٹس (Booklets) یک لیٹرز (Documentary films) ڈاکیومنٹری فلموں کو تیار کرتی ہے اور لوگوں میں خوب پھیلاتی ہے مگر شراب کی دکانوں کو مذہبی اہمیت کے مقامات جیسے مسجد، گرودوارے اور گرجا گھروں و درگاہوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے قریب کھولنے سے منع بھی کیا ہے اور قانون بھی بنایا ہے مگر اکثر شراب کی دکانیں ایسی ہی جگہوں پر پائی جاتی ہیں اور کئی تو کھلی ہیں بھی تو ایسے ہی مقامات کے قریب اسکے علاوہ ملک کے دور افتادہ اور پسماندہ دیہاتوں

اور علاقوں میں جہاں پینے کے صاف پانی تک دستیاب نہ ہو وہاں شراب آسانی سے حکومت کی طرف سے فراہم ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ بعض دیش بھگت جنتا دیش کی سیوا کی خاطر شہروں اور دیہاتوں میں شراب کا کشید کی گھریلو صنعتیں قائم کرتے رہتے ہیں۔ اسطرح جنتا کو خالص اور سستی شراب مل جاتی ہے مگر کبھی کبھی صرف سینکڑوں افراد شراب کی دیوی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور حکومت کی بھی آبادی کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ہو جاتی ہے۔ جتنا فروغ اس گھریلو شراب کی کشید کو حاصل ہو سکا ہے اتنا فروغ کسی دوسری صنعت کو باوجود حکومت کی ترغیب اور امداد (مالی یا تکنیکی) کے بھی حاصل نہ ہو سکا ہے۔

ابھی عالمی ادارہ صحت کی طرف سے تمام دنیا کی حکومتوں کو ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ اپنے یہاں درآمد کرنے یا خود بنانے والے (Baby Food) بے بی فوڈ کے ڈبوں پر یہ عبارت لازمی طور سے لکھوائیں کہ بچے کی صحت کا ضامن ماں کا دودھ ہی ہے اس سے مزید نفاذ کو مزید زہر کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ڈبوں کے دودھ سے جیسے بچے اسکے استعمال سے اسہال اور پیچش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسکے باوجود بے بی فوڈ بنانے والوں کا کاروبار دن بدن بڑھ رہا ہے اور اکثر کو حکومتوں کی سرپرستی حاصل ہے۔

آجکل دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک دنیا میں دائمی امن قائم کرنے میں غلطاں اور پیچاں ہیں۔ امن ہی کی خاطر امریکہ ویت نام اور کوریا میں انگلینڈ فاک لینڈ میں فرانس چاڈ میں دلچسپی لیتا ہے تو روس چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور افغانستان میں امن کا بول بالا کر رہا ہے۔ امریکہ امن کی خاطر پاکستان کو ہتھیاروں کی بھیک دیتا ہے تو روس بھارت کی ضروریات پوری کر کے امن کو مضبوط کر رہا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی علاقہ ان بموں (Bombs) اور (Neutron Bombs) نیوٹرون بموں کی رینج سے بچا نہیں اور مسلم ممالک میں امن کے نفاذ کی خاطر ہی یہ دونوں طاقتیں اپنے اپنے خلوص کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ آج دنیا میں نیوکلائی دھماکے اور جدید ہتھیار بھی امن ہی کی خاطر نصب کئے جا رہے ہیں۔

اب چند الفاظ اور اصطلاحیں اپنے لغوی معنوں کے علاوہ دوسرے معنی بھی اختیار کر رہی ہیں اور بعض اوقات ان کا مفہوم لغوی معنوں کے خلاف ہوتا ہے۔ اسی طرح آج برصغیر میں ... سے زیادہ استعمال

ہونے والا لفظ جمہوریت ہے بنگلہ دیش میں اس
کے لئے کوشش حسینہ واجد اور خالدہ ضیا
کے علاوہ جنرل ارشاد بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان
میں M.R.D بھی اسی کے لئے تگ و دو کر
رہی تھی مگر جنرل ضیا نے میدان سے [illegible]
لیا رہا۔ بھارت تو ہمکو فخر ہے کہ دنیا میں
سب سے بڑی جمہوریت ہماری ہی ہے
اس جمہوریت کی خاطر آنجہانی اندرا جی نے
اپنی جان کی بلی دی جسکی بنیاد انکے والد
پنڈت نہرو نے رکھی تھی۔ اب یہی ذمہ داری
جناب راجیو جی اٹھائے جا رہے ہیں۔ مگر
حزب مخالف والوں کو جمہوریت خطرہ میں
نظر آ رہی ہے اور انکا خیال ہے کہ اگر جمہوریت
کی بقا ہو سکتا ہے تو صرف چرن سنگھ
جی کی لیڈرشپ میں ورنہ نہیں۔ مگر چندر
شیکھر جی کو اس سے اختلاف ہے مگر تمام
اس بات پر متفق ہیں کہ جمہوریت کو خطرہ
درپیش ہے اور اب وہ ایک ہی خاندان
کا ورثہ بن گئی ہے۔

جمہوریت کی خاطر بھارت کی لسانی
بنیادوں پر تشکیل ہوئی اور اب بھی ایک
ایک صوبے میں کئی کئی زبانیں بولی اور
سمجھی جاتی ہے اور ابھی بہت سی زبانوں
کو نمائندگی ملنی ہے۔ ایک ہی ریاست میں
الگ الگ زبان بولنے والوں میں جو خلوص
و محبت پیدا کی گئی ہے اسکی نظیر دنیا میں ملنی
مشکل ہے۔

جمہوریت اور سیاست لازم و ملزوم
ہیں۔ جمہوریت ہی کی خاطر سیاست والوں نے
دین اور سیاست کو بالکل الگ کر دیا ہے۔
اس لئے بعضوں کے نزدیک سیاست شجر ممنوعہ
قرار پا چکی ہے تو کئی سیاست والوں نے مذہب
کو طلاق دیدی ہے کیونکہ انہیں سیاست
میں کوئی اصول اور ضابطہ پسند نہیں تھا وہ
جمہوریت ہی کی خاطر اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے
ہیں یا کبھی اسی پارٹی کو تقسیم کر دیتے ہیں
نہیں تو پھر تیسری پارٹی میں داخل ہو جاتے ہیں
اگر جمہوریت تقاضہ کرے تو گھر واپس آ کر اپنی
پرانی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی
تو انکا ضمیر بھی تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اپنی پارٹی
بدل لیں یا خود کوئی نئی پارٹی بنا لیں جس میں
رکن بھی وہ صدر بھی وہی ہوتے ہیں۔ نیتا
جمہوریت ہی کی خاطر اقتدار حاصل کرتے
ہیں اور اقتدار کے لئے زبان کی بنیاد پر علاقہ
کی بنیاد پر مذہب کی بنیاد پر لوگوں میں پھوٹ
ڈالتے ہیں اور لوگوں کو سیکولرزم کا درس

دیتے ہیں۔ اسی جمہوریت کی خاطر گاؤں گاؤں
میں پڑوسیوں پڑوسیوں میں بلکہ گھروں میں لوگ
ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ باپ
ایک پارٹی میں تو بیٹا دوسری پارٹی میں اور پوتا
تیسری پارٹی میں ہوتا ہے۔ اب ایسی سیاست
ہی لوگوں کا مذہب بن جاتی ہے۔ یہ سب لوک
سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے الکشن سے قبل
ہوتا ہے اور جب سیاست کو مذہب بنا لیا
جاتا ہے تو پھر ملک کی وزیر اعظم کا آنگ
رکشک آتنک وادی بن جاتا ہے۔ اسکا جدید
ترقی، قومی یکجہتی اور انسانیت دوستی
کے وہ مظاہر سامنے آتے ہیں جسکی مثال
دنیا بھر میں ملنی محال ہے۔ وہ سیاست
داں جو غنڈوں اور لیڈروں کی مدد سے
الکشن میں کامیاب ہوتے تھے انکی رہنمائی
کر کے معصوم بیگناہ بوڑھوں بچوں عورتوں
اور مردوں کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کراتے
ہیں اور کروڑوں کی جائداد لوٹ کر جلا دیتے
ہیں۔ پولیس خاموش تماشائی بنی رہتی ہے کیونکہ
ہماری حکومت سیکولر حکومت ہے یہاں اس
طرح کی تماشے نہ چلیں ....؟

ہماری ریاستوں کے اعلی پولیس افسران
اور عدلیہ کے فاضل منصفین وظیفہ یابی کے
بعد فرقہ پرست اور فاشسٹ پارٹیوں میں
ملک کی بھلائی کی خاطر اپنی خدمات لگا رہے
ہیں۔ فوج کے اعلی عہدیدار فوج سے
سبکدوش ہو کر غیر ملکی جاسوسوں کی مدد
کرتے ہیں۔ ہمارے سابق وزیروں اور اعلی
سیاستدانوں پر C.I.A یا K.G.B کے
ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے
آزادی ملنے کے ۳۷ سال تک کے
تجربوں کے نتائج مغربی ملکوں کی ذہنی
غلامی سے اور دوہری جمہوریت کی وجہ سے ہمیں حاصل ہو چکے ہیں
[illegible] متاثر ہو چکے ہیں
رونا تو ملت کے ادیبوں پر آتا
ہے جن کو ادب میں خدا اور پیغامبر سے
ALLERGY الرجی ہے وہ اسلام کی
اہمیت کو بے ادبی تصور کرتے ہیں۔
ہمارے دانشور ملت کی فلاح
Elucation ایکشن اور اس میں
کامیاب ہونے والی پارٹیوں سے وابستہ
رکھتے ہیں۔
[illegible]
[illegible] پیدا کرنے والے نے
[illegible]
گی تو دنیا جنت بن سکتی ہے۔

قطعات

عطا عابدی دربھنگوی

(۱)

غیروں کا بھروسہ کیوں، یہ فرض ہمارا ہے
گرتے کو اٹھا ڈالیں سوتے کو جگا ڈالیں
صدیوں سے ہے پاؤں میں زنجیر جو پگھلا دیں
ہر جبر و تشدد کی بنیاد ہلا ڈالیں

(۲)

زمیں کے لاکھوں ہی شمس و قمر کی آزمائش ہے
شب ظلمت کے سنّاٹے میں سحر کی آزمائش ہے
مخالف جو ہوا تو کیا ہوا جرأت دکھا اپنی
عطا پھر آج تیرے بال و پر کی آزمائش ہے

(۳)

گھبرائیے نہ آنکھ کو یوں تر بنا لیجئے
کچھ اور دل کو ضبط کا خوگر بنا لیجئے
مل جل کے اب سنوار دیجئے محنت کشوں کی صف
قطروں کو جمع کر کے سمندر بنا لیجئے

(۴)

دیئے اب جلانے کو جی چاہتا ہے
اندھیرا مٹانے کو جی چاہتا ہے
ہمیشہ سے ہے جن کی آنکھوں میں آنسو
انہیں اب ہنسانے کو جی چاہتا ہے

محمد بن زعیم ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

حیاتِ نو — تنقید و تحلیل

تقریباً دو سالوں کی طویل اور صبر آزما مدت کے بعد انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کے نمائندہ حیات نو کا دوبارہ اجراء ایک فال نیک ہے۔ سب سے پہلے حیات نو ۱۹۸۹ء میں جاری ہوا اور اس وقت سے اب تک مالی مشکلات اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر کئی بار نکلا اور بند ہوا۔ لیکن منزل کو پالینے کی لگن اور جستجو ہو تو سنگ راہ کی ٹھوکروں سے مزید جوش و ولولہ پیدا ہو کر قدم دیوانہ وار خود بخود منزل کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ حیات نو نے جنوری ۱۹۹۶ء سے پھر عزم سفر تازہ کیا ہے اور اس عہد کے ساتھ کہ اب انشاء اللہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہوا کرے گا۔

پہلی نظر اداریہ پر جاتی ہے۔ نئے مدیر طارق فوز فلاحی صاحب نے اس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے ملک کے عوام خصوصاً امت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے ہیں کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں، کبھی سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور امن و سکون کا گہوارہ تھا۔ یہاں کے باشندے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد کے شریک ہوتے تھے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب بھائی بھائی تھے۔ وہ لکھتے ہیں، یہاں گرو نانک جیسا امن و آشتی کا پیامبر، گاندھی جیسا اہنسا کا علمبردار، جواہر لال نہرو جیسا لیڈر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسا آزادی کا متوالا پیدا ہوا۔ اس ملک کے اندر جانوروں تک کو مارنا گناہ اور پاپ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہ! آج اسکی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ آج ہر طرف ظلم و زیادتی ہے، تشدد ہے، مار دھاڑ ہے، قتل و غارت گری ہے۔ آگے چلکر لکھتے ہیں کہ اب ملک کے ہر شہری کو آگے بڑھنا ہے۔ خصوصاً ہم مسلم ملت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ وہ امن و آشتی کی سب سے بڑی امین ہے وہ اٹھے اور اس حدیث انصر اخاک

علی (؟) اور مظلوم) کو بنیاد بنا کر آگے بڑھے اور ملک سے تشدد کو دور کرنے کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ درس قرآن اور درس حدیث کے تحت بالترتیب، دنیا پرستی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے، اور دنیا یا آخرت۔ مضامین خوب ہیں لیکن غیر معمولی مختصر۔

ابوبکر اصلاحی کے مضمون "جمہوری طریقہ انتخاب کی سب سے بڑی خامی امیدوار سسٹم" سے سیری نہیں ہوتی نہ تو موضوع سے پوری طرح انصاف کیا گیا ہے اور نہ طرز تحریر میں وہ سلاست اور روانی ہے جو قاری کو اپیل کر سکے۔ مضمون میں نہ تو جمہوریت اور جمہوری طریقہ انتخاب کو غلط ثابت کیا گیا ہو اور دوسری طرف اسلام کے طریقہ انتخاب پر بحث کرتے ہوئے صحیح طریقہ انتخاب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن مضمون اتنا مختصر اور نامکمل ہے کہ قاری کی تشفی نہیں ہوتی اور احساس ہوتا ہے کہ موضوع کے کئی گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ اگر اسی مضمون کو تحقیقی بنیاد پر لکھا جاتا تو ایک بہت اچھی کوشش ہوتی۔ نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر

ڈاکٹر محمد ابو النور الیہ یدی کا مضمون تسخیر کائنات معلومات افزا ہے۔ مترجم ساجد الہ آبادی نے اسکو بڑی محنت سے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں کہیں جملوں کی بے ترتیبی اور ترجمہ کی خامیاں کھٹکتی ہیں۔

عبدالحی فاروقی کے سلسلہ وار مضمون "کمیونزم کی فکری بنیادیں" کو تحقیقی ضابطوں کے تحت، کافی محنت، لگن اور جستجو سے مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلی نظر میں کمیونزم اور سوشلزم کی تعریف اور ان کے مفہوم سے فرق کو واضح کرتے ہوئے، مارکس کے بیان کردہ اصولی فرق کو جو مضمون نگار نے تسلیم کرلیا ہے کہ اشتراکیت کا ایک اولین یا جبوری دور ہے (اسی کو اس نے سوشلزم کہا ہے) اور دوسرا اور آخری دور تکمیلی دور ہوگا (اسی دور کو اس نے کمیونزم سے تعبیر کیا ہے) پھر وہ سوشلزم کے نام سے ہی کمیونزم کے نظریات کا مفصل مطالعہ کرتے ہیں۔ دوسری قسط (فروری ۱۹۸۵ء) میں سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں مارکس کے پیش کردہ نظام کی طرف توجہ دلاتے ہیں اس کا پیش کردہ یہی نظام کمیونزم تھا۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ کمیونزم کس طبقاتی نزاع کے نتیجہ میں وجود میں آیا اور مارکس نے یہ نظام پیش

کرتے وقت کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ تیسری قسط (مارچ ۱۹۸۵ء) میں انھوں نے مارکس کی پیش کردہ مختلف اصطلاحات پر تحقیقی بحث کی ہے۔ عبدالحی صاحب کی کوشش لائق ستائش ہے، اللہ کرے زور تحقیق اور زیادہ۔ لیکن کہیں کہیں تحقیقی کمزوریاں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ حوالہ جات نقل کرنے میں بھی مروجہ طریقہ سے روگردانی کی گئی ہے جو کھٹکتی ہے۔ کہیں نمبر تو دیئے ہیں لیکن نیچے کوئی حوالہ نہیں اگر حوالے نقل بھی کئے ہیں تو صفحہ نمبر، سن اشاعت وغیرہ کا تذکرہ نہیں اور کہیں عبارت کے ختم ہوتے ہی حوالہ کی عبارت نقل کر دی گئی ہے۔

توقیر عالم کا مضمون "تدوین حدیث" بڑی حد تک معلوماتی جائزہ ہے، جس میں تحقیقی انداز اپنانے کی امید افزا کوششیں کی گئی ہیں پہلی قسط میں حدیث کی اہمیت، تدوین کی ضرورت اور تدوین کے تحت صحابہ کرام کے کارناموں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے۔ دوسری قسط (فروری ۱۹۸۵ء) میں تابعین، تبع تابعین، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل صحاح ستہ کا مختصر تذکرہ ہے، اور آخر میں غلط فہمی کا ازالہ کے عنوان سے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تدوین حدیث کا کام دور صحابہ ہی سے شروع ہو گیا تھا۔

آغا شورش کاشمیری کی تحریر "مدینۃ النبی میں" سوز عشق سے سلگتی ہوئی اور عقیدت و محبت میں ڈوبی ہوئی تحریر ہے۔ احساسات و جذبات کی فراوانی اور الفاظ کا ایک سیلاب ہے جو امڈ امڈ کر صفحہ قرطاس پر بہہ رہا ہے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جذباتی عقیدت، دوسری طرف اپنے تئیں ندامت کے احساس سے مرتب عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ فنکار کے آنسوؤں سے سنواری گئی یہ تحریر حقیقت میں شاہکار ہے۔

طالب ہاشمی کا مقالہ "حضرت ام معبد خزاعیہ" (فروری) ایک کامیاب کوشش ہے۔ ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں، اپنی گذشتہ تاریخ سے لاعلمی کی بنا پر اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں گھر کر رہی ہیں، ان کے ازالہ کیلئے ہم کو اپنی تاریخ کے اوراق پلٹنے ہوں گے اور اعلیٰ کردار کی حامل شخصیات خصوصاً صحابہ و تابعین کی زندگیوں کا مطالعہ غیر معمولی سودمند ثابت ہوگا۔

ابو احمد فلاحی کا مقالہ "اخوت انسانی اور اسلام" ایک جامع مقالہ ہے جس میں قرآن

وحدیث کی روشنی میں اسلام کی تعلیم کردہ اخوت انسانی کے صحیح تصور کی وضاحت کی گئی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآن نے ہی وطنی، علاقائی اور لسانی عصبیتوں پر کاری ضرب لگا کر تمام عالم کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اسی اخوت نے ہم کو جغرافیائی حدود میں محدود نہ کر کے عالمگیر حیثیت دی ہے۔ اسی نے ہماری وطنیت کا تصور بھی دیگر وطنی تصورات سے کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ وارفع ہے۔

سلطان احمد اصلاحی کا مقالہ "حقوق شہریت میں اسلامی مساوات کی ایک جھلک" کی دوسری قسط (فروری ۱۹۸۲ء) ایک مبسوط اور تحقیقی مقالہ ہے۔ قرآن وحدیث اور مستند فقہ کی کتب کی مدد سے ترتیب دیا گیا یہ مقالہ تحقیقی اعتبار سے اس شمارہ کے جملہ مضامین میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام نے مختلف طبقات کے درمیان جس قسم کی مساوات قائم کرنے کا سبق دیا ہے کوئی دیگر مذہب یا نظریہ آج تک نہ دے سکا۔

سید اسعد گیلانی کے "انقلاب کے جاں گسل تقاضے" ہماری آج کی نوجوان نسل خصوصاً دعوتی کام کرنے والوں کیلئے ایک دستور اور ایک لائحہ عمل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ جسکا تخیلی انداز قاری کو اپیل کرتا ہے۔ دعوتی سرگرمیوں میں انتہائی کرب و اذیت اور مصائب و آلام سے دوچار ہونا ایک لازمی امر ہے لیکن ان کربناک مراحل سے گزر کر جو منزل سامنے آتی ہے اس کی دلکشی راہ کی مشکلات کو بھولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس منزل کے وہ راہی کامیاب ہوتے ہیں جو ہر طرف سے ناطہ توڑ کر حصول منزل کو ہی اپنا واحد مطمح نظر بنا کر، اپنی ساری قوتیں یکجا کر کے ٹھوکروں سے آگے بڑھنے کا درس لیتے ہوئے رواں دواں رہتے ہیں۔ حقیقی کامیابی دراصل اسی وقت نصیب ہوتی ہے جو مخالفین سے سخت تنازعہ اور کشمکش کے بعد حاصل ہو۔

طارق [illegible] کا مضمون "بیسویں صدی کے ایک عظیم اسلامی مفکر" الاخوان المسلمون کے بانی حسن البنا شہید کی انقلابی زندگی کا مختصر جائزہ ہے جس میں انکی پیدائش سے لیکر شہادت تک کے اہم واقعات، انکی دعوتی سرگرمیوں اور ان پر توڑے گئے تشدد و مظالم کو پرسوز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ٹی۔ ایف فلاحی نے ملک کے ایک المناک المیہ جسکو تاریخ بھوپال گیس المیہ کے نام

سے یاد کرتی ہے، پر قلم اٹھا کر پوری تحقیق و [illegible] کو علم و تدبر کے دریا میں ڈوب کر اپنے تاثرات صفحۂ قرطاس پر منتقل کئے ہیں۔ ایک ایسا [illegible] جس نے بھی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور جس کے گھر کے چھ افراد کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ چکے ہیں [illegible] ہو۔ ریلیف کا کام کرنے والے اس کے پاس جاتے ہیں اور بڑے نرم لہجے میں اس سے کہتے ہیں بابا کھانا کھا لیجئے مگر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، زمین گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے [illegible] پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں۔ ریلیف کا کام کرنے والے اس سے آنکھوں میں آنسو لئے کہتے ہیں تو حسرت و یاس کے عالم میں جواب دیتا ہے میں وہ ٹوٹا ہوا کیا کروں گا میرا اس دنیا کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتظامیہ کی غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں کھیلوں کے شہر بھوپال کی ہنستی مسکراتی زندگی ویرانی میں تبدیل ہو گئی۔ کتنی بیواؤں کے جگر گوشے ان سے چھینے جا چکے [illegible] کے سہاگ لٹ گئے کتنے ہی بچے تڑپ تڑپ کر دم توڑ گئے اور کتنے ہی اپنے والدین سے محروم ہو کر [illegible] زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے [illegible] سیکڑوں بینائی کھو بیٹھے اور ہزاروں لوگ موت کی وادیوں میں کھو گئے۔ جو ہنستا کھیلتا ویرانہ، رونق بھی آبادی۔ [illegible]

مجاہدین کے حوصلے۔ یہ دستور جند میں، افغانستان اور وہاں کے باشندوں کے حالات و کوائف کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرتا ہے۔

فروری کا اداریہ مختلف ممالک میں اسلام کی سرگرمیوں کے متعلق مفصل معلومات فراہم کرتا ہے اور نوجوانوں کو اقوام عالم کے سامنے عملی زندگی کی مثال پیش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ اداریہ بہت جاندار اور تحریک افزا ہے۔

مارچ کے اداریہ میں اسلامی انقلابی تحریک کے چار پہلوؤں پر توجہ دلائی گئی ہے جو پروفیسر خورشید احمد کے مقالہ سے ماخوذ ہیں۔ (۱) تحریک کا مقصد جزوی یا وقتی تبدیلی نہیں بلکہ پورے نظام زندگی کی اصلاح ہے (۲) فکری انقلاب (۳) علمی انقلاب (۴) اسلامی خطوط پر ایسے بین الاقوامی تنظیمی اداروں کا قیام جو اسلامی تحریک کی جانب پیش رفت کی علامت ہوں۔ اداریہ نے ان پہلوؤں سے اتفاق کرتے ہوئے ان پر مفصل بحث کی ہے۔ جو قابل مطالعہ ہے۔

ابو سلمیٰ فلاحی کا دو قسطوں میں "عقیدۂ آخرت، اسکی اہمیت اور ضرورت" ایک علمی اور تحقیقی مقالہ ہے جس میں مضمون نگار نے قرآن وسنت کی روشنی میں عقیدۂ آخرت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے اسکو انسانی

معاشرہ کیلئے ضروری قرار دیا ہے کہ جب تک کسی شخص کو یہ احساس نہ ہوگا کہ اُسے ایک روز خدا کے رُو برُو اپنے اعمال و افعال کا حساب دینا ہے، اس وقت تک اسکی نظروں میں نہ تو توحید و رسالت کی کوئی اہمیت ہوگی اور نہ ہی اُس کا سیرت و کردار مثالی ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کی لگام تو شہوات و نفسانیت کے ہاتھوں میں رہے گی اور وہ ساری زندگی گناہوں کے دلدل میں پھنسا رہے گا۔

عالم اسلام اور عالم نصرانیت شیخ تقی الدین حسن القضمان کی کتاب "صفحات من حاضر الاسلامی" سے ماخوذ ہے جس میں اسلام اور نصرانیت کی کشمکش کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نصرانیت نے استشراق کے نام پر اسلام اور مسلمانوں پر جو حملے کئے ہیں ان کا بھی تجزیہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مترجم محمد عارف نے مضمون کو اردو کے قالب میں بڑی محنت سے ڈھالا ہے اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

علامہ اقبال مریم جمیلہ کی نظر میں اقبال کی فکر و نظریات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اقبال نے اپنی فکر میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں اور اپنے نظریات میں وہ کس حد تک حقیقی اسلامی نظریات سے بھٹک گئے ہیں۔ ان سب کی نشاندہی خود انکی شاعری اور تحریروں کی روشنی میں کی ہے۔ یہ مضمون خالص علمی اور تحقیقی ہے۔

حکیم مشتاق احمد (پاکستان) کے مضمون پاکستانی اطباء اور خاندانی منصوبہ بندی کی پہلی قسط، تحریک ضبط الولادت کی تاریخ اور اس کے اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تمدنی نقصانات کی بحث پر مشتمل ہے۔

شعر و نغمہ کے کالم میں منصف مبارکپوری کی غزل

حوادث سے دل پر شوق نے عزم جواں پایا
طریق عشق میں ہر خار کو جوشش فشاں پایا
غم فرقت بھی رہتا ہے وصال یار میں شاید
گلوں کے ساتھ ہی بلبل کو محو نوحہ خواں پایا
وہیں آگے کی بربادی میرا دل چھونے لگتی ہے
جوانوں کو جہاں بے فکر و سرمست ایں و آں پایا

اور انقر ایم۔ اے کی غزل

وفا کا جب لیے تم سے عہد باندھا
بلاؤں کی ہے زد میں گھر ہمارا
سبک ساران ساحل کی بلا سے
سفینہ ہے بھنور میں گر ہمارا

میں جدید اور تیکھا انداز دل کو موہ لیتا ہے۔

لیکن وفا کا جب سے تم سے عہد باندھا میں "ہے" کی تکرار کھٹکتی ہے۔ شعر و ادب میں جب تک فکر و فن کی آمیزش اس حد تک نہ ہو کہ انکی شناخت مشکل ہو جائے اس وقت تک فن پارہ وجود میں نہیں آتا۔ نہ تو محض لفظی صنعت گری ادب کے دوام کی ضامن ہوتی ہے اور نہ محض فکر ادب کو خلود بخشتی ہے۔ آج اردو میں جو تعمیری ادب (ادب بمعنی خاص) پیش کیا جا رہا ہے اس میں انحراف کا رجحان عام ہے۔ تعمیری ادب کی بے پناہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ادباء و شعراء کو باطل نظریات کے سامنے سینہ سپر ہو جانا چاہئے موجودہ دور کی بے راہ روی اور مغرب زدگی کے تباہ کن اثرات سے نوجوانوں کو متنبہ کرنے اور انکو صحیح سمت کی نشاندہی کرنے میں شعر و ادب ایک موثر رول ادا کر سکتا ہے۔

منصف مبارکپوری کی غزل؛

خود بینی و سر افرازی سے
رتبہ کسی کا بڑھتا نہیں
بنا ہے عزت میں بے سوا
گو کتنی ہی مجروح کیا ہے

اور اختر نظمی کی غزل؛

کہاں رہ گئے وہ یہاں آتے آتے
ہوئے راہ میں رنگ ان آتے آتے
یہ مانا کہ ممکن نہیں تم سے درماں
ذرا سن تو لو داستاں آتے آتے

نیز شاکر تسلیم کے چند اشعار

واہ صداقت الحمد اللہ
بات ہے کچھ باریک ہے بابا
دل ہی کو بس چین نہیں ہے
ویسے سب کچھ ٹھیک ہے بابا

عصر نو کی نایابی کا کا چھوتا، اور قلب کی گہرائیوں کو چھو لینے والا حقیقت نگاری کا انداز وہ متاثر کرتا ہے۔ فکر کی ندرتوں کو پیرایہ میں الفاظ کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

آخر میں چند باتیں حیات نو کی ترتیب و تنظیم کے بارے میں؛

مجموعی طور سے رسالہ کی ورق گردانی اور دیکھنے کے بعد یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس کے تقریباً سارے مضامین میں ایک مخصوص فکر جاری و ساری ہے۔ میری رائے میں حیات نو کے صفحات میں ہر مکتبہ فکر کے فنکاروں کو جگہ دی جانی چاہئے۔ مضمون سے اختلاف کی صورت میں اخلاقی نوٹ لگایا جا سکتا ہے۔ اسکی تنظیم و ترتیب پر بھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی

غلطیاں اور جملوں کی بے ترتیبی بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔ مضامین جو قسط وار آرہے ہیں انکی ہر قسط کے آخر میں باقی آئندہ۔ لکھنا بھی ضروری ہے۔ بیشتر مضامین دعوتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کوشش یہی کی جانی چاہیئے کہ دعوتی مضامین کے ساتھ ساتھ رسالہ میں علمی اور خصوصی طور پر تحقیقی مقالات کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ تاکہ علمی دنیا میں بھی اسکی پذیرائی ہو۔ تحقیقی مضامین اگر ہیں تو ان میں بھی عام طور سے ایسی خامیاں محسوس ہوتی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ اس طرف خاص توجہ دی جانی چاہیئے۔ اداریہ مختصر، جامع، موثر اور جاندار ہونا چاہیئے۔ بہت زیادہ طویل اداریہ متاثر نہیں کرتا اور نہ دور رس اثرات چھوڑتا ہے۔

رسالہ میں اگر ایک کالم تعمیری ادب کیلئے مخصوص کر دیا جائے تو اس کی افادیت بڑھ جائے گی۔ اسی طرح اہم اسلامی مفکرین اور علمی شخصیتوں کے انٹرویو کا سلسلہ بھی قارئین کی معلومات میں اضافہ کا سبب ہوگا اور دلچسپی کا باعث بھی۔ سرورق پر سنہ و ماہ اور مقام اشاعت نیز اس میں یکسانیت رکھی جانے۔ (اندر جلد نمبر اور شمارہ

بقیہ صفحہ ۱۱ پر

(بقیہ حلقۂ یاراں)

صاحب کا حفیظ جیسا ہونا چاہیئے تھا وہ بات نہیں۔ "مولانا ابوالکلام آزاد اور انکی خدمات" مضمون اچھا ہے اگر ذرا انداز بدل کر لکھا جاتا تو اور بھی اچھا مزید اثر انگیز ہوتا۔ "ترانۂ فلاح" میں ترانے کی سی روانی اور ہیجان بالکل نہیں ہے۔ ہاں دو ایک مصرعے بہت خوب ہیں۔ رواں اور سبک بھی ہیں اور معنی خیز بھی

مفت ہاتھ آئے تو مستوں کو یہاں جام طہور
روشنی ہم کو ملی ہے تیری قندیلوں سے
دست و بازو کو یہاں قوت صحرائی ملی

مضمون "یہ نمازی یہ تیرے پر اسرار بندے" بڑا دلچسپ اور نصیحت آمیز ہے اسے شائع کر کے آپ نے قوم پر احسان کیا ہے۔ خدا آپ کو اجر دے۔ ترتیب نکھر گئی اور زندہ نظمیں اور جیتے جاگتے اشعار کو ضرور جگہ ملنی چاہیئے ایسی حالت میں کہ جب اردو رسائل کے قارئین کا فقدان ہو آپ نے رسالہ جاری کر کے عزم و حوصلہ کا ثبوت دیا ہے خدا آپ کو مزید حوصلہ اور کامرانی نصیب کرے مگر اس کے لئے مقابلی روح کی ضرورت ہے۔ تسلسل لازمی ہے۔

والسلام
توقیر احمد خاں

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

حلقۂ یاراں

جبریل امین صدیقی
عبید اللہ فہد
توقیر احمد خاں

برادر مکرم جناب فارقلیط صاحب، ایڈیٹر حیات نو

سلام مسنون

بعافیت زندہ ہوں۔ توقع ہے آپ بھی بسلامت ہونگے!

حیات نو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آن زما مسلم پرسنل لا سے متعلق آپ کا پر مغز اور بروقت اداریہ بہت ہی پسند آیا۔ ماشاءاللہ رفتہ رفتہ حیات نو، ترقی کے منازل طے کر رہا ہے اور اپنے اغراض و مقاصد کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و ملت کی تعمیر نو میں اپنی انفرادیت بھی قائم کئے ہوئے ہے۔ رب کریم اسے دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے آمین

جبریل امین صدیقی
۱۸ رجون ۱۹۸۵ء

برادر مکرم طارق صاحب

سلام مسنون

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اب پہلے سے کافی بہتر ہو گیا ہے تحقیق اور تصحیح کا معیار بھی کافی بلند ہو گیا ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ میرا مضمون تو آپ کو مل ہی گیا ہوگا۔ محترم ڈاکٹر محمد یوسف خاں صاحب کا مضمون "شعرا لطبیعہ" جو میں نے جامعہ میں دیکھا تھا ابھی تک نہیں آسکا براہ کرم جون کے شمارہ میں دوسرے مضامین روک کر ضرور شائع کر دیں۔ انھیں کافی انتظار ہے۔ احباب کو سلام سنائیں۔

آپکا۔
عبید اللہ فہد

برادر مکرم

سلام مسنون

حیات نو کو نئی زندگی ملی قابل مبارکباد ہے۔

اپریل ۱۹۸۵ء کا شمارہ نظر نواز ہوا مسرت ہوئی اداریہ فکر انگیز ہے کاش کہ اس کو عملی جامہ پہنا دیا جائے! اچھا کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے۔ کے عنوان کے تحت ابوالکلا

بقیہ صفحہ ۵۴ پر

ٹی - ایف فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

رمضان المبارک کی تعطیل کے بعد مدرسہ میں ۲۰ جون ۸۲ء سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ تقریباً تمام طلبہ اپنے اپنے گھروں سے آ گئے ہیں۔ کچھ نئے طلبہ بھی تشریف لائے ہیں وسائل کی کمی اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے بہت سے طلبہ کو داخلہ کے خواہش مند تھے مجبوراً واپس جانا پڑا۔ بارش نے جس طرح تمام ماحول کو سرسبز و شاداب بنا دیا ہے ویسے ہی طلبہ نے جامعہ کے در و بام کو نئی زندگی اور رونق بخشی ہے۔ بہترین اساتذہ کی رہنمائی میں یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ خدا ان کی منزلوں کو ان سے قریب کر دے۔

جامعۃ الفلاح شعبہ نسواں میں بھی تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ تمام طالبات علم دین کے حصول میں ہمہ تن لگی ہوئی ہیں اور اپنی شفیق اور مہربان معلمات کی رہنمائی میں اپنے قدم آگے بڑھا رہی ہیں۔ خدا انہیں کامیابی عطا کرے۔

• نئے تعلیمی سال سے نئی درسگاہ (جو آٹھ بڑے کمروں پر مشتمل ہے اور جس کو پارٹیشن کے ذریعہ ۱۶ بنا دیا گیا ہے) میں تعلیم شروع ہو گئی ہے اور پرانی درسگاہ کو ہاسٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

• مرکز جماعت اسلامی نے مولانا نظام الدین اصلاحی کی خدمات دوبارہ حاصل کر لی ہیں اور امیر حلقہ کی حیثیت سے ان کو احمد آباد (گجرات) بھیجنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح سے جامعہ اور اس کے طلبہ ایک بہترین، قابل، شفیق اور مہربان استاذ کی رہنمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔

• بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولانا عمران صاحب فلاحی (البریاگنجی) استاذ جامعہ و نائب صدر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ موصوف ہوائی جہاز کے ذریعہ تشریف لے جائیں گے۔ خدا آپ کے اس سفر کو کامیاب کرے اور حج کو قبول فرمائے اور ان تمام مسلمانوں کو حج کی توفیق عطا کرے جن پر حج فرض ہو گیا ہے آمین۔